

حصولِ علم کے آداب، مثالی طالبِ علم اور اچھا عالم بننے کے زریں اصول
اور اس راہ میں پیش آنے والے مسائل کا بہترین حل

اچھا عالم بننے کے لیے....!



تالیف

فضیلۃ الشیخ عبد العزیز بن محمد السدحان حفظہ اللہ تعالیٰ

ترجمہ

حافظ فیض اللہ ناصر





اچھا عالم بننے کے لیے

حصولِ علم کے آداب اور اس راہ کی مشکلات کا عمدہ حل



تالیف: فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز سدحان حفظہ اللہ   ترجمہ: حافظ فیض اللہ ناصر حفظہ اللہ



مسلم پبلیکیشنز

12 عثمان غنی روڈ، سنت نگر، لاہور 042-37249678



مسلم پبلیکیشنز

تاسیس: مولانا حکیم عبدالمجید سوہدروی رحمہ اللہ بنام "مسلمان کمپنی" 1921ء
تجدید: مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ بنام "مسلم پبلی کیشنز" 1970ء

کتاب:
اچھا عالم بننے کے لیے....؟

تالیف:
فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز سدحان حفظہ اللہ

ترجمہ:
حافظ فیض اللہ ناصر حفظہ اللہ

اشاعت اول ستمبر 2014

12 عثمان غنی روڈ، سنت نگر، لاہور 042-37249678
2 فلور، الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور 042-37247266
0322-4044013 | 0322-4259678



ہماری کتب مل سکتی ہیں



لاہور: 36 لوئر مال، دارالسلام
دارالسلام، ڈیفنس، دارالسلام،
پیکو روڈ، دارالسلام اُردو بازار
مکتبہ اسلامیہ، اردو بازار
کتاب سرائے، اردو بازار
فیصل آباد: مکتبہ اسلامیہ، کوتوالی روڈ
مکتبہ اہلحدیث، امین پور بازار
گوجرانوالہ: نعمانی کتب خانہ، اردو بازار
حدیبیہ، پیپلز کالونی
راولپنڈی: مکتبہ عائشہ، راجہ بازار
کراچی: دارالسلام، مین طارق روڈ
فضلی سنز، اردو بازار
اسلام آباد: دارالسلام، F8 مرکز
گجرات: دارالایمان، نزد فوارہ چوک
کوئٹہ: مکتبۃ الہدیٰ،
شیرانی مارکیٹ آرچر روڈ

فہرست



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے ۔

عرض ناشر

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں بلاشبہ یہ علم و تحقیق کا دور ہے۔ ہر انسان اس میدان میں آگے بڑھنے کے لیے لگا ہوا ہے۔ وہی قومیں ترقی یافتہ ہیں جنھوں نے علم و تحقیق کے میدان میں جھنڈے گاڑے ہیں۔

حصولِ علم کے جذبات کی موجودگی دیگر شے ہے اور حصولِ علم کے راستے کی رکاوٹوں کو ہٹا کر علم حاصل کرنے کے ذرائع کے متعلق جاننا دیگر شے ہے۔ ان معلومات سے علم کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔ نفع بخش اور نقصان دہ علم کے مابین فرق کیا جا سکتا ہے۔ وقت سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور زندگی کے اہداف کا تعین کر کے حصولِ علم کی منزل کو قریب تر کیا جا سکتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک طالب علم کچھ پڑھتا رہتا ہے مگر وہ محض ایک مطالعہ ہی ثابت ہوتا ہے اس سے نہ اس کی ذات کو فائدہ ہوتا ہے نہ دوسرے ہی مستفید ہو پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر طلباء و طالبات حصولِ علم کے اسباب و آداب سے یکسر نا آشنا ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب علم کے انھی آداب و اسباب کو بڑے عمدہ پیرائے میں واضح کرتی ہے۔ دینی طلبہ و طالبات کے علاوہ عصری علوم کے حاملین بھی اس سے برابر استفادہ کر سکتے ہیں۔

سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض کی علمی شخصیت فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز السدحان حفظہ اللہ

نے بڑی محنت سے اپنے تجربات و مشاہدات کے علاوہ سلف صالحین کے واقعات سے مزین ایک وقیع کتاب تیار کی ہے۔ اس کا ترجمہ نوخیز مترجم مولانا حافظ فیض اللہ ناصر حفظہ اللہ نے کیا اور بعد ازاں مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ نے نظر ثانی کی اور ان کی بہو محترمہ ام حماس تیمیہ نے اس کی پروف ریڈنگ کی اور کتاب کو تکمیلی مراحل تک پہنچایا۔ میں ان تمام احباب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے طلبہ کے لیے ایک عظیم اور مفید کاوش کو منظر عام پر لانے کے لیے مقدور بھر کوشش کی۔

اللہ ان کی سعی قبول فرمائے اور راہروانِ علم کے لیے ان کی منزل قریب تر کر دے۔ آمین

محمد نعمان فاروقی

مسلم پبلی کیشنز

سوہدرہ گوجرانوالہ/لاہور

اگست 2014ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَ صَحْبِهٖ وَ مَنْ وَالَاهُ أَمَّا بَعْدُ!

علم دین، اہل اسلام کی بنیادی ضرورتوں میں سے سب سے زیادہ ضروری ہے، اس لیے کہ یہ دنیا میں سعادت مندی اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد، ہر دور میں علمِ دین کی مشتاق رہی ہے۔ علماء و شیوخ کے حلقاتِ دروس سے مستفید ہونے کے لیے اہلِ ایمان نے اپنے گھربار چھوڑے، دوسرے شہروں اور ممالک کی طرف لمبے لمبے سفر طے کیے اور علم کی پیاس بجھانے کی خاطر طرح طرح کی صعوبتیں اٹھائی ہیں۔

حصولِ علم کا شوق بیدار اور رغبت پیدا ہو جانا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ علم ایسی دولت ہے جو صرف اسے ملتی ہے جس پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، اسے دین کا علم عطا فرماتا ہے۔ اس دولت کو پا کر بندہ بصیرت کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہے۔ اسی کے ذریعے سے لوگوں کے اخلاق سنورتے ہیں اور اسی کی بدولت انسان کے قلب و ذہن کو معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے اور احکامِ شرعیہ کو سیکھنے کے بعد انھیں اپنی زندگی پر لاگو کرنا ممکن ہوتا ہے۔ علم دین رکھنے والا فرد معرفتِ الٰہی، کائنات کے اسرار و رموز اور

مقصدِ تخلیقِ بشر کو جان لیتا ہے تو اسے خود اپنے لیے بھی عبادات، اخلاقیات اور معاملات میں راہ نمائی میسر آتی ہے اور دوسروں کے لیے بھی وہ راہ نما و رہبر بن جاتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ علم دین بارش کی مانند ہے جو جہاں بھی برسے، چاہے آدمی کے گھر میں، مسجد میں، بازار میں یا کسی اور جگہ پر، فائدہ ہی پہنچاتی ہے۔

اس عظیم و پاکیزہ علم کو پانے کے لیے بہت سے احباب جب تیار ہو جاتے ہیں تو طرح طرح کے سوالات ان کے ذہنوں میں تذبذب پیدا کرنے لگتے ہیں کہ میں کہاں سے تعلیم حاصل کروں؟ کون سا ادارہ اور کس ادارے کا نصاب میرے لیے مفید ہوگا؟ اور تعلیم کے بعد میرا مستقبل کیا ہوگا؟ اس طرح کے سوالات کا ذہن میں پیدا ہونا حصولِ علم کے لیے شوق و عزم ہی کی علامت ہے۔

بہت سے طلبہ نے جب مجھ سے اس طرح کے سوالات کیے تو میں نے سوچا کہ ان تمام سوالات کے جوابات مہیا کرنا اور اس کے بعد راہروانِ علم کو کامیاب اور مثالی شخصیات بننے کے لیے علم کے آداب، حصولِ علم کے فوائد و ثمرات اور اس کے اغراض و مقاصد سے متعارف کروانا بہت ضروری ہے، چنانچہ میں نے اپنی کوشش کے مطابق علمِ دین اور آدابِ علم کے متنوع پھولوں کو جمع کیا اور انھیں ایک گل دستے کی شکل دے دی اور اب یہ گل دستہ کتاب کی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ میری اس ادنیٰ سی کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت سے نوازے اور اسے قارئین کے لیے نفع بخش بنائے۔ (آمین)

إِنَّهُ تَعَالٰی سَمِیْعٌ مُجِیْبٌ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.

عبدالعزیز بن محمد السدحان

الریاض، 1417ھ

حرفِ چند

اسلامی تعلیمات کے سیکھنے اور سکھانے کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ ہر بندۂ مسلم علم و حکمت کی دولت سے مالا مال ہو اور وہ اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنے اور دنیا کی امامت کا فریضہ ادا کرنے کے لیے، اپنے اندر مہارت پیدا کرے تا کہ اللہ کی زمین پر نفاذ دین کی راہ ہموار ہو سکے۔ علمِ دین دراصل اپنی اور دوسرے انسانوں کی اصلاح کا ایک مشنری پروگرام ہے جو زمین پر خدا کی نیابت و خلافت کہلاتا ہے۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اسی مشن کی تکمیل کے لیے وقتاً فوقتاً مبعوث ہوتے رہے۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب اس مشن کو پورا کرنا اس امت کے اصحابِ علم کا فریضہ بن گیا ہے اور اسی لیے اس عظیم فریضے کے حاملین کو انبیاء کے وارث ہونے کا اعزاز بخشا گیا ہے۔ اب علمائے کرام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے منصبِ خلافت و نیابت کا حق ادا کرنے کے لیے آگے بڑھیں تا کہ اغیار کی سازشوں کا شکار مسلم امہ کی منزلِ مراد کی جانب راہ نمائی کا فریضہ انجام دیا جا سکے۔

اللہ کا دین بہت بڑی نعمت اور عظیم سرمایہ ہے اور اس دین کی سمجھ بوجھ پانے کے لیے شریعت کا علم حاصل کرنا سعادت کے عالی ترین درجہ پر فائز ہونے کے مترادف ہے۔ اس علم کے ذریعے انسان علمی، اخلاقی اور روحانی طور پر ایک اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے۔ اس نعمت اور سرمائے کے حصول کے لیے لازمی طور پر ان

چند اصول وضوابط اور آداب کا سیکھنا اور اپنانا نہایت ضروری ہے کہ جن کا اہتمام جسم میں رُوح کی حیثیت رکھتا ہے۔علم کے حصول سے نہ صرف اخلاق وکردار کی تربیت اور روحانیت کی اصلاح ہوتی ہے بلکہ معاشرے پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اربابِ مدارس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفس کا اہتمام کریں اور اساتذہ کو معلم ہونے کے ساتھ ساتھ مربی بننے کی تلقین کریں تاکہ سندِ فراغت حاصل کرنے والا ہر طالب علم باعمل ہونے کے علاوہ اصلاح و تربیت سے اس طرح منجھا ہوا ہو کہ وہ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن کی تفسیر نظر آئے۔ اسے اپنے مشن کے تقدس کا لحاظ ہو، خوفِ الٰہی کے سوا اس کے دل میں کسی کا ڈر نہ ہو، وہ خود کسی کے سامنے جھکنے کے بجائے وقت کے فرعونوں کو اسلام کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دے اور وہ حقیقی طور پر نبوت کی نیابت منوا سکے۔ اگر تعلیمی ادارے ایسے جاں باز اور باکردار افراد تیار کرنے لگیں تو آج کی یہ رُو بہ زوال امتِ مسلمہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔

حصولِ علم کے معاون امور میں سب سے زیادہ اہم کام فرائضِ اسلام کا اہتمام اور محرمات سے اجتناب ہے۔ جو طالب علم اس معاملے میں سستی اور لاپروائی کا شکار رہتا ہے وہ علم سے فیض یاب نہیں ہو پاتا کیونکہ علم نورِ الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے نور سے کسی گناہ گار کو منور نہیں فرماتا۔

بہت سے طلبہ مقصد کا تعین نہیں کر پاتے اور یونہی سالہا سال سلسلۂ تعلم جاری رکھتے ہیں۔ بغیر تعینِ مقصد حصولِ علم ایسے ہی ہے جیسے بغیر تعینِ منزل محوِ سفر رہنا۔ اسی طرح بعض طلبہ مقصد کا تعین تو کرتے ہیں مگر اس کے حصول کے لیے سنجیدہ

نہیں ہوتے اور حصول علم کے لیے مطلوبہ محنت وکوشش کی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ یہ دونوں قسم کے طلبہ یا تو سرے سے ہی حصولِ علم سے عاری رہتے ہیں یا اس کمال کو نہیں پہنچ پاتے جو کامیاب طالب علم کا خاصہ ہونا چاہیے، چنانچہ ہر طالب علم کو سب سے پہلے اپنے مقصد کا تعین کرنا چاہیے اور پھر اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے انتہائی محنت، جدوجہد اور شوق ورغبت سے اس کا حصول ممکن بنانا چاہیے۔

اسی طرح طلبہ عموماً دورانِ تعلیم وقت کی قدر و اہمیت سے بے نیاز رہتے ہیں اور شعوری و لاشعوری طور پر اپنا قیمتی وقت عبث کاموں میں ضائع کرتے رہتے ہیں۔ اس بنا پر انھیں وقتی نقصان کے علاوہ میدانِ عمل میں بھی ندامت اٹھانا پڑتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا احساس بعد از فراغت ہوتا ہے جب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے اور یہ قانونِ فطرت ہے کہ بیتا ہوا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا، لہٰذا اپنے کل (مستقبل) کو بہتر بنانے کے لیے اپنے آج، یعنی حال کو غنیمت جانتے ہوئے اس سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔

بعض طلبہ شدید محنت کے باوجود بھی حصولِ علم میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے سامنے مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں ہوتا جس کی وہ صورت گری کریں۔ یا پھر نصاب، نظام اور طرزِ تعلیم ان کے لیے نامانوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو ماہرین تعلیم کی ناکامی ہے کہ وہ طلبا کے مزاج اور ملک وقوم کی ضروریات سے ہم آہنگ نصاب اور نظامِ تعلیم نہ دے سکیں۔

طالب علم کا اپنے پروردگار سے تعلق، والدین سے سلوک، اساتذۂ کرام اور احباب و رفقاء سے برتاؤ کیسا ہونا چاہیے؟ اسے اپنے شب و روز کیسے بسر کرنے چاہئیں؟ حصولِ علم میں کن امور وشرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟ اور دینی، اخلاقی و

معاشرتی امور میں عامۃ الناس کے لیے آئیڈیل اور نمونہ بننے کے لیے کن صفات کا اس میں ہونا ضروری ہے؟ یہ تمام اور ان جیسے دیگر حصول علم سے متعلقہ بے شمار سوالات ومسائل کے بارے میں فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز السدحان کی یہ کتاب ایک قابل قدر کاوش ہے۔ اس میں تعلیمی مسائل و امور کے بارے میں مؤلف نے آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور اسلاف کرام کے مفید پند ونصائح اور ان کی محنت ہائے شاقہ کے واقعات کے ذریعے بڑے احسن انداز میں طالبانِ علوم نبوت کی راہنمائی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اعانت وفضل سے راقم نے اسے عربی سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ باری تعالیٰ بندۂ قصیر کی اس ناتمام سعی کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ مؤلف اور ناشر کے لیے صدقۂ جاریہ اور ذریعہ مغفرت بنانے کے ساتھ ساتھ متلاشیانِ علم کے لیے مشعلِ راہ بنائے۔ آمین۔

خیر اندیش

حافظ فیض اللہ ناصر

30-10-2010 یوم الأربعاء

hfnasir@yahoo.com

علم اور اہلِ علم کی فضیلت

جب میں متلاشیانِ علم کو حلقاتِ علم میں جلوہ افروز دیکھتا ہوں تو انتہائی فرحت ومسرت اور اطمینانِ قلب محسوس کرتا ہوں اور ان پہ رشک کرتا ہوں کہ کیسے انھوں نے دنیوی عیش و آرام کو چھوڑ کر علمی مجالس سے دل لگا رکھا ہے۔ جس وقت لوگ نرم وگداز بستروں پر نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں اُس وقت یہ بندگانِ الٰہی اپنی کتابوں کو ہی سرمایۂ زندگی سمجھے ہوئے ان میں مستغرق ہوتے ہیں۔ انھوں نے دنیا ومافیھا سے بے نیاز ہو کر ان کی لذتوں کو صرف اس امید وجستجو کے لیے ترک کر دیا کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس دنیا میں کامیابی و کامرانی سے سرفراز اور آخرت میں مغفرت ونجات سے ہمکنار فرما دے۔

اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے بھی حاملین علم کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی ہے:

﴿ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَٰٓؤُا ﴾

''درحقیقت اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں۔''[1]

یہاں اللہ تعالیٰ نے خشیّت کو اہل علم کا خاصہ قرار دیا ہے، اس لیے کہ وہ عام لوگوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی معرفت زیادہ رکھتے ہیں اور جو شخص اپنے رب کی معرفت میں کمال رکھتا ہو وہ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خائف اور اس کی

---

[1] الفاطر 35:28.

رحمتوں کا امیدوار رہتا ہے۔

علم ہی اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے حصول، دنیوی زندگی کو پاکیزہ بنانے، برزخی زندگی میں کامیابی پانے اور اخروی زندگی میں جہنم سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ علم ہی اخلاق و کردار کو سنوارتا ہے اور علم ہی کی یہ دولت انسان انواع و اقسام کے اختلافات میں الجھنے اور اُن کے فتنہ و شر میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قرآن کریم میں انسان کی جہاں بھی تعریف و ستائش ہوئی ہے وہ اس کے علم کا ثمرہ ہے اور جہاں جہاں اس کی مذمت و تذلیل ہوئی ہے وہ اس کی جہالت کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں ان تمام امور کو بیان کرنے کوشش کی گئی ہے جو طالبِ علم کے لیے حصولِ علم کی راہ پر گامزن رہنے کے لیے زادِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی وہ کون سے ذرائع ہیں جو طالب علم کے لیے حصولِ علم میں نفع بخش ہو سکتے ہیں؟ کون سی چیزیں علم کے حصول کے لیے مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں؟ کون سی وجوہات حصولِ علم سے مانع بنتی ہیں؟ کن باتوں سے طالب علم میں شوق و رغبت پیدا ہوتی ہے؟ حصولِ علم کے کون سے طریقے مفید ہوتے ہیں؟ اور کون سی عادات و خصائل ہوتی ہیں جو طالبِ علم کے اخلاق و کردار کو سنوارتی اور بگاڑتی ہیں؟ ان تمام امور و مسائل کے متعلق اس کتاب میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

فضیلتِ علم، اہلِ علم کے اخلاق و اوصاف اور علماء کے مقام و مرتبے کے متعلق بہت سی کتب موجود ہیں۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم اور اہلِ علم کی فضیلت سے متعلق فرمایا ہے:

«مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَطْلُبُ فِيْهِ عِلْمًا سَلَكَ اللّٰهُ بِهٖ طَرِيْقًا مِنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ وَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا لِطَالِبِ الْعِلْمِ رِضًا بِمَا يَصْنَعُ وَإِنَّ الْعَالِمَ يَسْتَغْفِرُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالْحِيْتَانُ فِيْ جَوْفِ الْمَاءِ وَإِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ وَإِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا إِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ أَخَذَهٗ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ»

’’جو شخص حصولِ علم کی غرض سے رختِ سفر باندھتا چلتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے جنت کے راستے پر گامزن فرما دیتا ہے۔ طالب علم کے عمل کو دیکھ کر فرشتے مسرت و انبساط سے اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔ صاحبِ علم کے لیے زمین و آسمان میں موجود ہر چیز حتیٰ کہ پانی کی تہہ میں تیرتی مچھلیاں بھی مغفرت کی دعائیں کرنے لگتی ہیں۔ عابد پر عالم کی فضیلت ایسے ہی ہے جیسے روشن رات میں چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہوتی ہے۔ یقیناً علماء ہی انبیاء کرام علیہم السلام کے ورثاء ہوتے ہیں اور انبیاء اپنی وراثت میں کوئی درہم و دینار چھوڑ کر نہیں گئے بلکہ ان کا ترکہ تو صرف علم ہی ہوتا ہے، لہٰذا جو شخص اسے حاصل کر لیتا ہے یقیناً وہ بہت کچھ پالیتا ہے۔‘‘ [1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

[1] رواہ أصحاب السنن والإمام أحمد، صحیح الجامع: 20/35.

"علم کی یہ دولت انسان رب العالمین کا تقرّب حاصل کر لیتا ہے اور ملائکہ و ملاء اعلیٰ کا پیارا بن جاتا ہے۔ یہ کس قدر شرف و فضل کا مقام ہے۔ اس شرف و فضل کے حصول کے لیے دنیوی مقام و مرتبہ کیوں کر رکاوٹ ہوسکتا ہے؟" [1]



[1] مفتاح دار السعادة: 108/1.

حصولِ علم کے آداب

آدابِ علم سے واقفیت

ہر طالب علم کے لیے ان آداب کا سیکھنا ضروری ہے جنھیں اپنا کر ہی علم کے زیور سے کما حقہ آراستہ ہوا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلاف ہمارے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ انھوں نے عیش و آرام اور لہو و لعب کو ترک کر کے خود کو فقط حصولِ علم کے لیے وقف کر دیا تھا، وہ نرم و گداز بستروں کو چھوڑ کر شب بھر تعلیم و تعلّم کے لیے بیدار رہتے، سفر و حضر میں علم ہی ان کا رفیق رہا، اساتذہ، طلبہ اور احباب و رفقاء سے جب بھی گفتگو کرتے تو کسی علمی موضوع کو ہی زیرِ بحث لاتے۔ عمر بھر تعلیم و تعلُّم میں گزارنے کے باوجود وہ خود کو کبھی بھی تمام علوم کا عالم اور ماہر نہ سمجھتے تھے۔

اساتذۂ کرام سے گزارش

اساتذہ کرام کو چاہیے کہ وہ طلبہ کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ آداب کی بھی تعلیم دیتے رہیں، اس لیے کہ علم بھی اسی وقت مفید ثابت ہوگا جب اسے اس کے آداب و ضوابط کے ساتھ سیکھا جائے۔ نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«اِنَّهٗ سَيَأْتِيْ قَوْمٌ يَطْلُبُوْنَ الْعِلْمَ فَإِذَا رَأَيْتُمُوْهُمْ فَاسْتَوْصُوْا

بِهِمْ خَيْرًا»

''جب تمھارے پاس حصولِ علم کے لیے نوجوان آتے ہیں تو تم جب انھیں (تعلیم میں غیر سنجیدہ) دیکھو تو انھیں خیر و بھلائی کی نصیحتیں کرتے رہا کرو۔''[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ استاذ اپنے شاگرد کو بڑے علم (قرآن و حدیث) سکھانے سے پہلے چھوٹے علم (آداب) کی تعلیم دے۔ طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ آداب سیکھیں۔ ان پر عمل پیرا ہوں۔ شیوخ و اساتذہ پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں طلبہ کی راہنمائی فرمائیں اور انھیں آداب و اخلاق اور خیر و بھلائی کی نصیحت کرتے رہیں کیونکہ بھلائی کی باتیں بتلانے والا اجر و انعام کا اسی طرح مستحق ہوتا ہے جس طرح بھلائی کا کام کرنے والا اجر پاتا ہے۔

بنیادی اخلاق و آداب کی اہمیت

انسانی زندگی کا ہر معاملہ اور ہر کام کچھ متعین اصول و قواعد کی بنیاد پر انجام پاتا ہے۔ ان اصول و قواعد پر عمل درآمد ہوگا تو تب ہی متعلقہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ بعینہٖ عملِ تعلیم بھی کچھ اصول و آداب کا متقاضی ہے۔ اگر کوئی طالب علم حصولِ علم کے آداب کو سیکھے گا اور علم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ ضرور اس میں کامیاب ہوگا۔

امام ذہبی رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی مجلس میں تقریباً

[1] مسند الطيالسي: 3/644. السلسلة الصحيحة، ص: 280.

پچاس ہزار لوگ شریک ہوا کرتے تھے جن میں سے صرف پانچ سو افراد ان سے احادیث اور احکام و مسائل کا علم لیتے اور باقی تمام ان سے آدابِ زندگی سیکھا کرتے تھے۔[1]

حصولِ علم کے ضروری آداب واوصاف

فقط رضائے الٰہی مطلوب ہو

طالب علم پر سب سے پہلے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس مقدس پیشے سے منسلک ہونے کے بعد، ریا کاری یا دنیوی مقاصد کے حصول کے بہ جائے خالصتاً رضائے الٰہی کے حصول کو پیش نظر رکھے لیکن بہت ہی کم طلبہ ایسے ہوتے ہیں جو حصولِ علم سے عارضی مفادات کے بہ جائے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی چاہتے ہیں۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبِّیْ.

اپنی طاقت کے مطابق اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ نیت میں حصولِ رضائے الٰہی کے سوا کسی اور امر کا شائبہ تک نہ ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ اس کی سوچ کے مطابق ہی معاملہ فرماتا ہے۔ اگر سوچ صحیح ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ خیر و بھلائی کا معاملہ کرتا ہے اور اگر سوچ ہی بری ہو تو پھر نتائج بھی برے برآمد ہوتے ہیں۔

جب طلبِ علم میں صدقِ نیت ہو تو اللہ تعالیٰ آسانیاں پیدا فرماتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ

[1] السیر: 316/11.

''جو لوگ ہمارے بارے میں جہد و محنت کرتے ہیں تو ہم بھی اپنی راہوں کی طرف ان کی راہنمائی کرتے ہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''[1]

مدارس و شیوخ سے استفادہ کیا جائے

علم دین کا یہ کمال ہے کہ اس کی اشاعت و ابلاغ کے لیے ہر شہر میں علمی مراکز قائم ہیں۔ ہمیں دور دور کی سفری مشکلات نہیں اٹھانا پڑتیں۔ یہ علم دین ہی کا خاصہ ہے کہ اس کی تعلیم بالکل مفت فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان مدارس و جامعات میں شیوخ و اساتذہ کا وجود بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے جو صرف اسلامی تعلیمات کی تدریس و اشاعت میں مگن رہتے ہیں۔

لٰہذا ہمیں ان مدارس و اساتذہ کرام کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اگر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے دیگر شہروں میں جانا پڑے تو حصول علم کے متلاشی کو اس سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ مدارس و جامعات ہی ایسے علمی مراکز ہیں جو انسان کو ضلالت و جہالت کے اندھیروں سے نکال کر روشنی عطا کرتے ہیں، لٰہذا ان علمی مراکز و مدارس کی طرف رختِ سفر باندھنا بھی باعثِ حصولِ جنت ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ»

---

[1] العنکبوت 29:69.

”جو شخص حصولِ علم کے لیے رختِ سفر باندھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔“[1]

معلوم ہوا کہ علم کے نور سے خود کو منور کرنے کی خاطر سفر کرنا گویا جنت کی جانب سفر کرنا ہے۔ اسی طرح علماء و اساتذہ کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کی قدر کرنا چاہیے، ان کے علم سے استفادہ کرنا چاہیے اور ان کے علمی تجربات اور اخلاقیات سے زیادہ سے زیادہ سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ علم کی بقا انھی کے وجود سے ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى إِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوْسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوْا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَأَضَلُّوْا»

”اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح ختم نہیں کرے گا کہ وہ لوگوں سے علم محو کر دے بلکہ وہ علماء کو اٹھا لے گا۔ اس طرح سے وہ علم کو ختم کرے گا، حتیٰ کہ جب کوئی عالم باقی (زندہ) نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو امام و پیشوا بنانے لگیں گے۔ جب ان (جاہلوں) سے (احکام و مسائل کے متعلق) سوال کیا جائے گا تو وہ بغیر علم کے ہی (لوگوں کو) فتوے دیا کریں گے۔ وہ خود تو گمراہ ہوں گے ہی لیکن لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔“[2]

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 2699. [2] صحيح البخاري، كتاب العلم، باب كيف يقبض العلم، حديث: 100، صحيح مسلم، كتاب العلم، باب رفع العلم وقبضه، حديث: 2673.

اس لیے دین کے حقیقی علماء کی رحلت سے پہلے ان کی حیات و وجود کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور ان سے علوم وفنون میں استفادہ کرنا چاہیے کیونکہ انھی کے ذریعے سے علم کا ابلاغ واحیا ہوتا ہے اور ان کے چلے جانے سے علم بھی اٹھ جاتا ہے۔

علمی مجالس میں شرکت کی جائے

علم، محض پڑھنے سے ہی نہیں آتا، بلکہ سننا بھی حصولِ علم کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ علمی مجالس میں شرکت کرنے سے احاطۂ علم میں بہت اضافہ ہوتا ہے، لہٰذا ایسی مجالس جن میں علمی موضوعات زیر بحث ہوں اُن میں شرکت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی طرح اختلافی مسائل پر ہونے والے مباحثے ومناظرے میں بھی شرکت کرنی چاہیے۔ اس سے فریقین کے دلائل کا علم حاصل ہوتا ہے اور پھر ان دلائل کے پیشِ نظر صحیح اور راجح مؤقف معلوم ہوتا ہے۔ طرفین سے پیش ہونے والی احادیث و آثار، ان کی صحت وضعف، وجوہِ ترجیح وتعلیل اور ان کے مآخذ کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی دیگر بہت سے علمی فوائد کے حصول کے لیے ایسی علمی مجالس میں شرکت کا اہتمام نہایت ضروری ہے۔

کلاس میں باقاعدہ حاضری کا التزام کیا جائے

طالبِ علم کو چاہیے کہ وہ خود کو کلاس میں حاضری کا پابند بنائے اور تمام اسباق میں باقاعدہ اور پورے وقت کے لیے شرکت کو یقینی بنائے کیونکہ جب بھی کسی طالبِ علم میں حصولِ علم کا شوق پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس پر رحمت و برکات کے دروازے کھول دیتا ہے اور اس کے تمام معاملات میں آسانیاں پیدا فرما دیتا ہے، چنانچہ علم کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ رخصت کم سے کم لے اور غیر حاضری تو

بالکل بھی نہ کی جائے، کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت قلیل ہے لیکن جہالت نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان ان امور کا تو شمار کر سکتا ہے جن کا اسے علم ہے لیکن ان امور کا احاطہ کرنا مشکل ہے جن سے وہ ناواقف ہے۔ کیونکہ جہالت، علم سے بہت زیادہ ہے اور جب انسان علم کا کچھ حصہ حاصل کر لیتا ہے تو جہالت کا اتنا حصہ اس سے کم ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے وہ علم حاصل کرتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی جہالت زائل ہوتی رہتی ہے، اس لیے اسباق میں مداومت سے ہی علم کی کمی کو پورا اور جہالت کو ختم کیا جا سکتا ہے اور اگر اس کا اہتمام باقاعدگی سے نہ کیا جائے تو پھر ہماری حالت میں تغیرّ آنا محال ہے۔ لیکن یاد رکھیے کہ کلاس میں حاضری کے معاملے میں بھی خلوصِ نیت ضروری ہے۔

کسی استاذ کی طرف سے تادیبی سرزنش کا خوف، تعریف وستائش کی امید، سزا وجرمانے کا ڈر یا انعام وستائش کا لالچ ہرگز نہ ہو کیونکہ ان امور سے حصولِ علم کا شوق جاتا رہتا ہے اور اگر نیت میں ہی خلوص نہ ہو تو پھر علمی نقصان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے انعامات وبرکات سے بھی محرومی مقدر بنتی ہے۔

لہٰذا کوشش کرنی چاہیے کہ ایک پورا دن تو کجا کسی سبق کا تھوڑا سا حصہ بھی نہ چھوٹنے پائے کیونکہ چھوٹ جانے والے سبق کے متعلق استاذ جو نکات ایک مرتبہ بیان فرما دیتے ہیں وہ دوبارہ کبھی حاصل نہیں ہو پاتے، پھر اسباق میں پیش قدمی ہی رہتی ہے، پچھلے اسباق کو دوبارہ نہیں پڑھایا جاتا اور اگر طالب علم حاضری کے معاملے میں غیر سنجیدہ رہے تو اسے علمی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

ابوالحسن کرخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں ابو حازم رحمہ اللہ کی مجلسِ علم میں جمعہ کے دن بھی حاضر ہوا کرتا تھا حالانکہ اس دن سبق نہیں ہوتا تھا لیکن میں ایسا اس لیے

کرتا کہ کہیں میری حاضری کی عادت ختم نہ ہو جائے۔[1]

لٰہذا ہر طالب علم کو چاہیے کہ وہ حتی المقدور حاضری کو یقینی بنائے تاکہ اسباق میں شرکت اور شیوخ سے استفادے کا تسلسل برقرار رہے۔

محنت اور کوشش سے کام لیا جائے

صرف ذوق وشوق رکھنا یا مسلسل حاضر رہنا حصولِ علم کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے انتہائی محنت اور جدوجہد بھی ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی مقصد محنت وکوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو پاتا جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾

''انسان کو صرف وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔''[2]

یعنی اگر کسی کام کے لیے محنت وکوشش سے کام نہ لیا جائے تو اس میں قطعاً کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی اور جس کام کے لیے جدوجہد کی جائے وہ کام ضرور ہو کر رہتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إِنَّمَا الْعِلْمُ مَوَاهِبٌ يُؤْتِيهِ اللّٰهُ مَنْ أَحَبَّ مِنْ خَلْقِهِ، وَلَيْسَ يَنَالُهُ اَحَدٌ بِالْحَسَبِ وَلَوْ كَانَ لِعِلَّةِ الْحَسَبِ لَكَانَ أَوْلَى النَّاسِ بِهِ أَهْلُ بَيْتِ النَّبِيِّ ﷺ.

''علم ایک وہبی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے اپنے محبوب بندے کو ہی عطا فرماتا ہے۔ یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ کوئی اسے حسب و

---

[1] الحث على طلب العلم، ص: 78. [2] النجم 53:39.

نسب کی بنیاد پر حاصل کر سکے کیونکہ اگر علم حسب ونسب کی بہ دولت حاصل ہوتا تو تمام لوگوں کی نسبت نبی ﷺ کے اہلِ بیت اس کے زیادہ حق دار ہوتے۔‘‘

یعنی علم اگر حسب ونسب کی بنا پر حاصل ہوتا تو آپ ﷺ کے چچا اور دادا اس سے کیوں محروم رہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہوتا ہے لیکن وہ بھی اس شخص کے لیے ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی نظر میں محبوب و پسندیدہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اوامر کی اتباع اور نواہی سے اجتناب کے ساتھ حصولِ علم کا ذوق و شوق ہو، خلوصِ نیت ہو اور محنت و کوشش سے بھی کام لیا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کی اس عطا کے حق دار بن سکو۔

مکمل انہماک و دلچسپی سے پڑھا جائے

سبق کا وقت شروع ہوجائے تو مکمل یکسوئی کے ساتھ اس میں متوجہ رہنا چاہیے۔ ذہن کو دوسرے معاملات و امور میں الجھانے سے گریز کرنا چاہیے۔ شیطان چونکہ علومِ دینیہ اور طلبائے دین کا دشمن ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ طلبا کے ذہنوں کو دیگر معاملات میں الجھائے رکھے لیکن اُس کے شر سے بچنے کے لیے ذہن کو اپنے مقصد میں محو و مگن رکھنا چاہیے۔

❁ امام شعبی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے کیسے علم حاصل کیا؟ تو انھوں نے جواب دیا:

بِنَفْيِ الْاِعْتِمَادِ، وَالسَّيْرِ فِي الْبِلَادِ، وَصَبْرٍ كَصَبْرِ الْحِمَارِ وَبُكُوْرٍ كَبُكُوْرِ الْغُرَابِ.

’’خود پر اعتماد نہ کرنے، مختلف شہروں کا سفر کرنے، گدھے کے صبر کی طرح صبر کرنے اور کوے کی طرح صبح سویرے جاگنے سے۔‘‘[1]

امام فرعانی رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں کہ ہم عبدالصمد ابن الفضل رحمہ اللہ کی مجلسِ حدیث میں شریک تھے اور وہ ہمیں پڑھا رہے تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ہم میں سے کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔ جب اس نے مسلسل دستک دینا شروع کر دی تو امام صاحب نے ایک شاگرد سے فرمایا کہ دیکھو کون ہے؟ اگر کوئی اصحابِ رائے[2] میں سے ہو تو دروازہ کھول دینا لیکن اگر اصحابِ حدیث میں سے کوئی ہو تو دروازہ مت کھولنا۔

حاضرین مجلس میں سے کسی نے پوچھا کہ کیا صاحبِ حدیث اس کے زیادہ لائق نہیں ہے کہ اس کے لیے دروازہ کھولا جائے؟ تو انھوں نے فرمایا: نہیں، اس لیے کہ اصحاب الحدیث کو بہ خوبی علم ہے کہ درسِ حدیث کے دوران حدیث پڑھنے اور سننے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں ہو سکتا تو پھر بھی وہ دروازہ کھٹکھٹائیں تو ان کی سزا یہی ہے کہ ان کے لیے دروازہ کھولا ہی نہ جائے لیکن اصحابِ رائے اس بارے میں معذور ہیں۔ انھیں احادیث کا ہی صحیح طور پر علم نہیں ہوتا تو پھر آدابِ حدیث سے وہ کیسے واقف ہوں گے۔[3]

امام ذہبی رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں کہ جب عبدالرحمٰن بن مہدی رحمہ اللہ حدیث کا سبق پڑھا رہے ہوتے تو ان کے طلبا اور شاگرد ایسے بیٹھے ہوتے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، یا جیسے وہ نماز میں مشغول ہوں۔[4]

---

[1] الرحلة في طلب الحديث، ص:196. [2] اصحاب رائے: وہ فقہا جو مسائل کے استنباط میں رائے اور قیاس سے کام لیں۔ [3] أدب الإملاء والاستملاء، ص: 112. [4] تذكرة الحفاظ: 331/1.

❁ اسی طرح احمد بن سنان رحمہ اللہ انھی کے متعلق ذکر کرتے ہیں کہ ان کی مجلس میں لوگ اس قدر انہماک سے بیٹھے ہوتے کہ نہ کوئی مسکراتا، نہ کوئی کھڑا ہوتا حتیٰ کہ کوئی قلم کی بھی آواز پیدا نہ ہونے دیتا اور اس طرح سبق کی طرف متوجہ ہوتے کہ جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ اور اگر آپ کسی کو مسکراتا یا بات کرتا دیکھ لیتے تو جوتا پہنتے اور مجلس سے اٹھ کر چلے جاتے۔[1]

اس لیے کہ ایسی مجلس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت نازل ہوتی ہے اور رحمت ان پر سایہ فگن رہتی ہے اور اس میں سنجیدگی اور متانت کے خلاف کوئی بھی فعل آدابِ مجلس کے خلاف ہے۔ امام ابن مہدی رحمہ اللہ کسی بھی بے ادبی ہونے پر مجلس سے تشریف لے جایا کرتے تا کہ علم کا ادب واحترام برقرار رہ سکے اور رحمت وسکینت سے محرومی نہ ہو جائے۔

انسان جب کسی بھی کام میں سنجیدگی اختیار کر لیتا ہے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مکمل انہماک و دلچسپی سے کام لیتا ہے تو وہ ضرور اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر وہ مال و دولت کے حصول میں دلچسپی لے تو وہ ضرور دولت مند بن جائے گا، اگر اخروی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے عبادت و ریاضت کا اہتمام کرنے لگے تو ضرور نجات سے ہمکنار ہوگا اور اسی طرح اگر وہ حصولِ علم میں انہماک و دلچسپی اختیار کر لے تو علم کے اس مقام پر فائز ہوگا جہاں اسے سب لوگ رشک کی نگاہ سے دیکھیں۔

دورانِ غیر حاضری کے اسباق کا تدارک کیا جائے

غیر حاضری یا رخصت کی وجہ سے جن اسباق میں شرکت نہ ہو سکے، انھیں

---

[1] السیر: 9/201,202.

نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے کیونکہ وہ بھی نصاب کا حصہ ہیں۔ انھیں اسباق کے دوران ہی استاذ سے سمجھ لینا چاہیے لیکن اگر مصروفیت کے باعث استاذ وقت نہ نکال سکتے ہوں تو پھر اپنے ساتھیوں سے وہ سبق پڑھ لینے میں عار محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ طالبِ علم اپنے ساتھیوں سے پڑھائی کے معاملے میں مدد لینے میں ندامت نہ محسوس کرے ورنہ جہالت و کم علمی کی بنا پر کامیابی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانا بڑے نقصان کا باعث ہے۔

اسباق و دروس ایک زنجیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر اس کی ایک بھی کڑی نکل جائے تو اس کے قبل و بعد کے اسباق کا آپس میں تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح طالب علم کا ایک بھی سبق چھوٹ جائے تو اس سے پہلے پڑھے گئے اور آئندہ پڑھے جانے والے اسباق کا آپس میں کوئی تعلق نہیں رہتا، اس لیے اس تعلق کو بحال رکھنے کے لیے کلاس میں حاضری کو یقینی بنانا چاہیے تاکہ ایسی صورت حال ہی پیش نہ آئے اور اگر کبھی رخصت کرنا ناگزیر ہو تو پھر اگلے روز فوت شدہ اسباق کو استاد یا کسی ہونہار ساتھی سے لازماً پڑھ لینا چاہیے۔

فوائد و حواشی کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے

اسباق کے دوران اساتذہ کے بیان کردہ نکات اور حواشی کو اسی کتاب پر یا علیحدہ کسی کاپی یا رجسٹر میں لکھ لینا چاہیے۔ حدیث ہے:

«قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ» ”علم کو لکھ کر قید کرو۔“[1]

گویا لکھنے سے علم قید ہو جاتا ہے اور جب بھی اس کی ضرورت پیش آئے تو

[1] السلسلة الصحيحة: 2026.

اسے پڑھا جا سکتا ہے لیکن اگر اس کا اہتمام نہ کیا جائے تو زیادہ دیر تک وہ نکات و فوائد ذہن میں محفوظ نہیں رہتے بلکہ کبھی نہ کبھی بالآخر بھول جاتے ہیں اور پھر ضرورت پڑنے پر طالبِ علم کفِ افسوس مَلتا ہے، لہٰذا آپ جب بھی کوئی کتاب خود پڑھیں یا اپنے استاذ سے سماع کریں تو اس سے متعلقہ جتنے بھی حواشی اور نکات بیان ہوں ان کو اولاً تو کتاب پر ہی تحریر کرلیا جائے اگر وہاں ممکن نہ ہوتو الگ کسی کاپی یا رجسٹر پر نوٹ کرلیا جائے۔ اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ ہر مضمون کے لیے علیحدہ کاپی خاص کی جائے۔ کسی ایک ہی کاپی یا رجسٹر میں ایک سے زائد مضامین کے حواشی نہ لکھے جائیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ایک تو ہر مضمون سے متعلقہ نوٹس علیحدہ مرتب ہو جائیں گے اور دوسرا جب وہ کتاب ختم ہوگی تو اس کتاب سے متعلقہ جزئیات کا ایک خزانہ کتابی شکل میں آپ کے پاس موجود ہوگا جس سے آپ تاحیات فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کتاب کی خوب جانچ پڑتال کی جائے

جب آپ کوئی نصابی یا غیر نصابی کتاب خریدیں تو اسے اپنی لائبریری میں ہی سجا کر نہ رکھیں، یا اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر اسے چھوڑ نہ دیں بلکہ اس کی خوب جانچ پڑتال کریں، یعنی اس کے مؤلف کا نام، حالاتِ زندگی اور اس کی دیگر تصانیف کا بھی علم ہو۔ جس موضوع پر وہ کتاب لکھی گئی ہے اس کی ضرورت و اہمیت آپ کو معلوم ہو اور اس کتاب کے تمام ابواب اور ان کے تحت بیان کی گئیں مباحث کا اجمالی خاکہ آپ کے ذہن میں ہو۔

ان تمام امور کو جاننے کے بعد آپ کتاب کا گہرائی سے مطالعہ شروع کریں

اور پھر دورانِ مطالعہ، اس موضوع پر مؤلف کا مؤقف سامنے رکھ کر، دیگر ائمہ و شیوخ کی آراء کو بھی دیکھیں اور پھر ان کے دلائل کا موازنہ کرتے ہوئے ان میں سے راجح مؤقف معلوم کریں۔ اس کے بعد راجح مؤقف کی وجوہاتِ ترجیح اور مرجوح مؤقف کی وجوہات کو ذہن نشین کر لیں تاکہ مسائل کے علم کے ساتھ ساتھ دلائل پر بھی عبور حاصل ہو سکے۔

ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو انتہائی مفید ثابت ہوگا اور نہ صرف اسی کتاب بلکہ اس موضوع پر لکھی گئی دیگر بہت سی کتب کے مطالعے میں آسانی ہوگی۔

مایوس و نا اُمید نہ ہوا جائے

بہت سے طلبہ جب کئی کئی ماہ یا سالہا سال محنت کرنے کے باوجود، علوم وفنون میں مہارت حاصل نہیں کر پاتے تو مایوس و نا اُمید ہو جاتے ہیں اور محنت کرنا چھوڑ دیتے ہیں، حالانکہ جب کوئی طالب علم خلوصِ نیت اور شوق و محنت سے اپنے کام میں مگن ہو تو اسے قطعاً نا اُمید نہیں ہونا چاہیے کیونکہ محنتی شخص کبھی ناکام نہیں ہوتا بلکہ کامیابی اس کے قدم ضرور چومتی ہے۔ ایسے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول نہایت قابل توجہ ہے۔ وہ اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

مَكَثْتُ فِي كِتَابِ الْحَيْضِ تِسْعَ سِنِيْنَ حَتَّى فَهِمْتُهُ.

''میں نے کتاب الحیض کو سمجھنے میں نو برس صرف کیے۔''[1]

لہٰذا ایسے طلبہ کو پریشان ہو کر نا امیدی نہیں اختیار کر لینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ

[1] طبقات الحنابلة: 1/268.

نے عام طور پر تمام انسانوں کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ کوئی شخص معمولی محنت سے کام لیتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے اور بعض نہ ذہانت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ ہی محنت کی زحمت گوارہ کرتے ہیں تو وہ ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض طلبہ شدید محنت کے باوجود بھی کوئی سبق یا بحث جلد سمجھ نہیں پاتے تو ایسے طلبہ کو ناامید ہو کر اس سبق کو ادھورا نہیں چھوڑ دینا چاہیے بلکہ اپنی محنت جاری رکھنی چاہیے کہ خلوص و محنت ہی کی بہ دولت اللہ تعالیٰ تمام مشکلات آسان فرما دیتا ہے۔

امام شنقیطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک مسئلے کی وضاحت نہیں ہو رہی تھی۔ بسیار کوشش کے باوجود میں ناکام رہا لیکن میں عزم کیے ہوئے تھا کہ اس مسئلے کو ضرور سمجھ کر رہوں گا، چنانچہ میں مسلسل اسی میں مشغول رہا اور میرا خادم شمع لے کر میرے سر پر کھڑا رہا، حتی کہ ساری رات بیت گئی اور فجر طلوع ہو گئی، تب کہیں میرا اِشکال زائل ہوا اور میں اُس مسئلے کو سمجھ گیا۔

اندازہ کیجیے کہ صرف ایک مسئلے کی وضاحت کے لیے انھوں نے ساری رات صَرف کر دی۔ اسی طرح کی اور بھی بے شمار مثالیں ہیں کہ اہل علم کس طرح سے حدیث و فقہ کے علم کے لیے سالہا سال کا وقت اور مال صَرف کیا کرتے تھے لیکن کسی بھی طرح کی تنگی و مشکل ان کے عزائم میں خلل انداز نہیں ہوتی تھی بلکہ شب و روز کی جُہدِ مسلسل کر کے وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

عجز و انکساری اختیار کی جائے

تمام معاملات میں خود کو دیگر ساتھیوں سے کم تر و ادنیٰ ہی سمجھنا چاہیے۔ کسی پر

نسبی، مالی یا علمی برتری نہیں جتلانی چاہیے کیونکہ اگر کوئی طالب علم خود کو صاحبِ علم اور دوسروں کو علم سے بے بہرہ سمجھتا ہے تو اسے اپنی ذات اور علم میں پائی جانے والی کمی اور نقائص کا کبھی علم نہیں ہوتا جس کے باعث وہ اُس کمی کو دور نہیں کر پاتا۔

لہٰذا ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ عملِ تعلیم میں عاجزی وانکساری کو اپنائے اور کبر و بڑائی سے دور رہے، چنانچہ اپنے ہم مکتب ساتھیوں سے پڑھنے اور سیکھنے میں عار محسوس نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اُس وقت کی ندامت و شرمندگی اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جب سندِ فضیلت حاصل ہونے کے باوجود لوگوں کی بعض اہم اور بنیادی مسائل میں بھی راہنمائی کرنے سے انسان عاجز ہوتا ہے۔ ہمیشہ خود کو طالب علم ہی سمجھنا چاہیے، عالم نہیں، کیونکہ جب آدمی خود کو تمام علوم وفنون کا ماہر سمجھنے لگتا ہے اور کسی غیر کو اپنے سے کم علم خیال کرنے لگتا ہے تو درحقیقت اس کی جہالت اس وقت عروج پر پہنچی ہوتی ہے کیونکہ علم تو ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ ہی نہیں ہے تو پھر اس پر مکمل عبور کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لَا يَتَعَلَّمُ الْعِلْمَ مُسْتَحْيٍ وَ لَا مُسْتَكْبِرٌ.

''شرمانے والا اور گھمنڈی شخص علم حاصل نہیں کر سکتا۔''[1]

یعنی اگر کسی مسئلے یا سبق میں کوئی مشکل درپیش ہو تو اپنے اساتذہ یا ہم مکتب ساتھیوں سے پڑھ لینے یا سوال کرنے میں کوئی عار اور شرمندگی نہیں محسوس کرنی چاہیے اور نہ ہی ذہن میں یہ نخوت جنم لینی چاہیے کہ میں کیوں اس سے سوال کروں یا میں اس سے کیوں پڑھوں؟ میں اسے اپنا استاذ کیوں مانوں؟ میں تو خود بہت بڑا

[1] فتح الباری: 1/27.

عالم ہوں۔ جس ذہن میں ایسی پلید سوچ پرورش پاتی ہے اس ذہن میں دین کا پاکیزہ علم نہیں آ سکتا۔ کیونکہ جو تکبر و نخوت میں مبتلا رہتا ہے اس کے دِل میں درحقیقت علم کا مقام ہی واضح نہیں ہوتا اور وہ اس کی قدر ہی کو نہیں پہچان سکتا۔ اس کے حصول کے لیے تو نہ صرف اپنا سب کچھ قربان کر کے درویشانہ زندگی اختیار کرنا پڑتی ہے بلکہ اسے مطلوب مان کر اور خود طالب بن کر، اگر اصحابِ علم کی چاکری بھی کرنا پڑے تو بھی قبول ہو۔

ایک شاعر محمد بن محمد الغزالی نے کیا خوب کہا ہے:

اَلْعِلْمُ حَرْبٌ لِلْفَتَی الْمُتَعَالِیْ   کَالسَّیْلِ حَرْبٌ لِلْمَکَانِ الْعَالِیْ

''جس طرح سیلاب بلند عمارت کو پاش پاش کر دیتا ہے اسی طرح متکبر عالم کے علم کو اس کا تکبر ختم کر دیتا ہے۔''

اساتذہ کا ادب واحترام کیا جائے

طالبِ علم پر اساتذہ کا ادب و احترام واجب ہے کیونکہ اساتذہ کے ادب و احترام سے وہ کچھ حاصل ہوتا ہے جو کتب سے حاصل نہیں ہو پاتا۔ طالب علم کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اساتذہ کے ادب کا لحاظ نہ رکھے۔ اسی طرح استاذ کے کلام کو اپنے فہمِ ناقص کی وجہ سے غیر مفید سمجھنا یا اپنا علم جتلانے کے لیے ان سے بحث و مباحثہ کرنا شقاوت و بدبختی کا باعث ہے۔ بلکہ جہالت سے نکال کر علم و ہدایت کی راہ دکھلانے والوں کا خود کو ہمیشہ احسان مند اور ان کے احسانات وعنایات کا قرض دار سمجھتے رہنا چاہیے اور ہر دم ان کی تعریف وتحسین میں لب کشا رہنا چاہیے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھایا میں اس کا غلام ہوں۔ اگر وہ مجھے بیچ بھی ڈالے تو میں برا نہ مانوں۔

محمد بن محمد الخادمي استاذ کے ادب واحترام کے متعلق کہتے ہیں:

رَأَیْتُ اَحَقَّ الْحَقِّ حَقَّ الْمُعَلِّمِ وَاَوْجَبَهٗ حِفْظًا عَلٰی کُلِّ مُسْلِمِ

''میری رائے میں استاذ کا حق تمام حقوق سے بڑھ کر ہے، اور اس کا پاس ولحاظ رکھنا ہر مسلمان پر زیادہ واجب ہے۔''

شیوخ واساتذہ کی تکریم وتعظیم کی تعلیم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دی ہے بلکہ ان کی بے ادبی کرنے والوں کو اپنوں میں شمار ہی نہیں فرمایا:

لَیْسَ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ لَّمْ یُجِلِّ کَبِیْرَنَا وَیَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَیَعْرِفْ لِعَالِمِنَا حَقَّهٗ.

''وہ شخص میرا امتی ہی نہیں جو بڑوں کی عزت نہ کرے، چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور عالم کا حق نہ پہچانے۔'' [1]

عالم کا حق پہچاننے سے مراد یہ ہے کہ ان سے پیش آتے وقت ان کی عزت وتوقیر کی جائے، ان سے بات کرتے وقت ادب واحترام ملحوظ رکھا جائے اور ان کی عدم موجودگی میں اگر ان کا تذکرہ ہو تو اچھے الفاظ سے ان کا ذکر کیا جائے۔

استاذ کی خدمت کرنا بھی آداب وتعظیم میں شامل ہے۔ طالب علم کو استاذ کے حکم کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے کہے بغیر ان کے کام نمٹا دینے چاہئیں کیونکہ جو تمھیں علم کی دولت سے مالا مال کرتا ہے، ان کی خدمت کرنا ان کے

[1] صحیح الترغیب: 1/ 24، حدیث: 101.

احسان کے شکریے کی ایک ادنیٰ سی صورت اور فلاحِ دارین کا ذریعہ بھی ہے، اس لیے خدمتِ اساتذہ کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔

خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے بیٹے کو امام اصمعی رحمہ اللہ کی خدمت میں حصولِ علم کے لیے بھیجا۔ وہ اپنے استاذ کا بہت خدمت گزار ثابت ہوا۔ ایک دن خلیفہ امام صاحب کی مجلس میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ وہ وضو فرما رہے ہیں اور ان کا بیٹا برتن ہاتھ میں لیے پانی ڈال رہا ہے تو خلیفہ کہنے لگا: امام صاحب! کیا آپ اسے یہ ادب سکھلا رہے ہیں اپنے استاذ کا؟ اسے تو یہ چاہیے تھا کہ ایک ہاتھ سے پانی ڈالتا اور دوسرے ہاتھ سے آپ کے پاؤں دھوتا۔

اساتذہ کی خدمت کے ذریعے، اُن کی دعائیں حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان کی دعائیں کامیابی و کامرانی کے دروازے کھولتی ہیں۔

اسی طرح اساتذہ کی بددعا سے بھی بچنا چاہیے کہ وہ کامیابیوں میں رکاوٹ بنتی ہے۔

علوم وفنون میں مہارت، اساتذہ کی نظر میں وقار اور ان کی دعاؤں سے عملی زندگی میں کامیابی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر وثواب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ کی موجودگی اور عدم موجودگی میں ان کا ادب کیا جائے۔

سوال کرتے ہوئے ادب ملحوظ رکھا جائے

بعض طلبہ میں ایک بری عادت پائی جاتی ہے کہ وہ علم و فہم کے باوجود بھی استاذ سے طرح طرح کے سوال کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مقصود علمی تشفی نہیں بلکہ صرف علمیت بگھارنا اور استاذ کو ذہنی اذیت دینا ہوتا ہے۔ یہ انتہائی گھٹیا اور مذموم

عمل ہے کیونکہ اس سے ایک تو استاذ کی بے ادبی ہوتی ہے اور دوسرا وہ عنداللہ استہزاء وتمسخر کی سزا کا مستوجب بنتا ہے، البتہ جو طلبہ لاعلمی یا نقصِ فہم کی بنا پر استاذ سے سوال کرتے ہیں تو یہ اچھا اقدام ہے کیونکہ جس مسئلے کا علم نہ ہو اس کے بارے میں سوال نہ کرنا جہالت میں ڈوبے رہنے کے مترادف ہے۔ لیکن اس میں بھی مندرجہ ذیل آداب کو ملحوظ رکھا جائے:

- استاذ سے سوال کرنے سے پہلے اجازت لینی چاہیے۔ اگر اجازت دی جائے تو سوال کریں ورنہ کسی اور مناسب موقع تک مؤخر کردیں۔
- اسی طرح جب استاذ پڑھا کر خاموش ہو پھر سوال کریں کیونکہ اس وقت استاذ اپنی بات مکمل کر چکا ہوتا ہے۔
- استاذ کی بات کاٹ کر سوال کرنا اچھی عادت نہیں ہے۔ یہ اخلاق کے بھی منافی ہے۔
- جب استاذ کسی اور کام میں مشغول ہو تب بھی سوال سے گریز کرنا چاہیے، جب تک کہ استاذ فارغ نہ ہو جائے جیسا کہ نبی مکرم ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک اعرابی آیا اور (دورانِ خطبہ ہی) پوچھنے لگا کہ قیامت کب آئے گی؟ نبی ﷺ نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی اور خطبہ فرماتے رہے، پھر جب آپ ﷺ فارغ ہو چکے تو فرمایا: قیامت کے متعلق سوال کرنے والا شخص کہاں ہے......؟ الخ[1]

آپ ﷺ کے اس شخص کے بارے میں پوچھنے سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کی بات سنی ضرور تھی لیکن اس کے عمل کو نازیبا سمجھا اور اس کا جواب نہیں دیا۔

---

[1] بخاری مع الفتح: 1/171، حدیث: 59.

❁ فضول و بے مقصد سوالات کرنے یا ایک ہی سوال کو بار بار کرنے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ اس سے وقت کا ضیاع ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ فضول سوالات کرنا حسنِ اسلام کے بھی منافی ہے۔ نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ»

''آدمی کے اسلام کی خوبی اسی میں ہے کہ وہ بے فائدہ باتوں کو ترک کر دے۔''[1]

اسلاف جب تدریس میں مشغول ہوتے اور کوئی طالب علم کسی ایسے مسئلے کے متعلق سوال کر دیتا جو ابھی تک پیش ہی نہ آیا ہوتا تھا تو اسلاف اس کا جواب نہ دیتے بلکہ کہتے:

دَعْنَا عَنْ هٰذَا حَتَّى يَقَعَ وَسَلْ عَمَّا وَقَعَ.

''اس مسئلے کے پیش آنے تک اسے چھوڑ دو۔ جو پیش آمدہ مسائل ہیں ان کے بارے میں سوال کرو۔''[2]

اسلاف بے فائدہ سوالوں کا اس لیے جواب نہ دیتے تھے کہ وہ وقت کی قدر کیا کرتے تھے اور اسے فضول سوال و جواب میں ضائع نہیں کرتے تھے۔

استاذ کے اخلاقی محاسن کو اپنایا جائے

اپنے شیوخ و اساتذہ سے حصولِ علم کے ساتھ ساتھ، ان کے اخلاقیات سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔ عبادات میں انھی کی طرح خشوع و خضوع اور سنن و

[1] جامع الترمذي، أبواب الزهد، باب فيمن تكلم بكلمة يضحك بها الناس: ح: 2317.

[2] تهذيب التهذيب: 8/274.

نوافل کا اہتمام کرنا چاہیے۔ معاملات میں صداقت وشرافت اور پابندیٔ وقت کو اپنانا چاہیے اور اخلاقیات میں علم اور شیوخ کے آداب اور حسن کردار میں ان کو نمونہ بنانا چاہیے۔

اساتذہ سے تعلیم وتعلم کا تعلق قائم کرنے کا مقصد صرف حصولِ علم ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان سے اکتسابِ اخلاق کو بھی حصولِ علم ہی کا حصہ سمجھنا چاہیے۔

امام سمعانی رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی مجلس میں پانچ ہزار کے قریب طلبہ شریک ہوا کرتے تھے، جن میں سے پانچ سو افراد ان سے صرف حدیث کا علم سیکھتے جبکہ بقیہ تمام لوگ علم کے ساتھ ساتھ ان سے اخلاقیات و آداب بھی سیکھا کرتے۔[1]

ابو بکر مطوعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ میں ابو عبداللہ (امام احمد) رحمہ اللہ کی مجلسِ حدیث میں بارہ سال تک شرکت کرتا رہا ہوں اور اس دوران میں نے ان سے احادیث کا علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ آداب واخلاقیات بھی سیکھے۔[2]

اس لیے علماء وشیوخ کی مجالس میں شرکت کا مقصد علمی فوائد کا حصول ہی نہیں بلکہ اکتسابِ اخلاق بھی ہونا چاہیے اور اس کے لیے عرصۂ تعلیم کے علاوہ بعد از فراغت بھی اساتذہ سے تعلق ورابطہ رکھنا چاہیے اور ان کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے رہنا چاہیے۔

حصولِ علم کے لیے رغبت وشوقِ اسلاف ...... ایک نظر میں

یہاں ہم حصولِ علم کے لیے طلبہ کے عزم واستقلال کو پختہ کرنے اور ان میں

---

[1] سیر أعلام النبلاء: 11/316. [2] سیر أعلام النبلاء: 11/316.

شوق ورغبت پیدا کرنے کے لیے اسلاف کی محنتوں، کاوشوں اور بلند پایہ ہمتوں پر مشتمل چند واقعات ذکر کرتے ہیں، جنھیں پڑھ کر جذبۂ محنت بیدار ہوگا:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

جب آپ کسی مسئلے کے متعلق مطمئن نہ ہوتے تو اس وقت تک ہمت نہ ہارتے جب تک اس کے مقصودِ اصلی کو جان نہ لیتے۔ اس کے لیے اگر آپ کو بہت ساری کتب کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا تو ضرور کرتے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں جتنی بھی آیاتِ صفات ہیں میں نے ان کی تفسیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی ایک ہی تفسیر پر متفق ہیں۔ میں نے اس کی تحقیق کے لیے چھوٹی بڑی بہت سی کتب اور سو سے زائد تفاسیر کا مطالعہ کیا ہے لیکن کسی بھی تفسیر میں مجھے آیاتِ صفات کے معروف مفہوم میں کسی بھی صحابی کا دوسرے صحابی سے تضاد و اختلاف نہیں ملا۔[1]

امام ابوجعفر ابن جریر طبری رحمہ اللہ

آپ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کی تالیفات اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ اگر ان کے یومِ ولادت سے یومِ وفات تک تمام دنوں پر انھیں تقسیم کیا جائے تو ایک دن کے ساٹھ اوراق بنتے ہیں۔ اس قدر آپ ہمت و محنت سے کام لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے شاگردوں سے تاریخ اسلام پر ایک تصنیف تیار کرنے کو کہا۔ وہ تقریباً تیس ہزار صفحات کی ضخیم کتاب بنتی تھی۔ انھوں نے اس سے عاجزی کا اظہار کیا تو آپ نے خفا ہوتے ہوئے فرمایا:

---

[1] تفسیر سورۃ النور، ص: 210.

''اللہ اکبر! کیا تمھاری ہمتیں ماند پڑ گئی ہیں؟'' [1]

امام یحییٰ بن شرف النووی رحمہ اللہ

آپ نے صرف پینتالیس برس عمر پائی لیکن ان کی کتب بیسیوں کی تعداد میں ہیں۔ چھوٹی کتابوں اور رسالوں کے علاوہ چند کتب جو ایک سے زائد جلدوں پر مشتمل ہیں، ان میں سے صحیح مسلم کی شرح، تهذيب الأسماء واللغات، رياض الصالحين، روضة الطالبين اور المجموع قابل ذکر ہیں۔

امام احمد بن حجر العسقلانی رحمہ اللہ

آپ کی معروف کتب میں سے احکام پر مختصر کتاب بلوغ المرام اور صحيح البخاري کی شرح فتح الباری ہے۔ ابن خلدون رحمہ اللہ نے آپ کے بابت فرمایا تھا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحيح البخاري تالیف کر کے اس کی شرح امت پر قرض چھوڑ دی ہے، پھر جب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی شرح فتح الباری تالیف فرمائی تو ابوالخیر سخاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آج اگر ابن خلدون زندہ ہوتے اور وہ فتح الباری دیکھتے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتیں اور وہ جان لیتے کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس قرض کو کما حقہ چکا دیا ہے۔ [2]

آپ تالیف و تصنیف کے ساتھ ساتھ تدریس و فتاویٰ اور خطابت کے میدان کے بھی شاہ سوار تھے۔ آپ کے عزم و ہمت اور استقلال کا اندازہ اس سے کیجیے کہ آپ نے حدیث: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ کو سو سے زائد واسطوں سے بیان فرمایا ہے اور اسی طرح ایک دن آپ نے ظہر اور عصر کے درمیانی مختصر سے وقت

---

[1] تذكرة الحفاظ: 712/2. [2] سيرة امام البخاري، ص: 132.

میں معجم الطبرانی الصغیر کا مطالعہ کر لیا تھا۔

امام محمد بن شہاب الزُّھری رحمہ اللہ

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ محمد بن شہاب الزہری رحمہ اللہ کے متعلق التقریب میں رقم طراز ہیں کہ ان کی بزرگی و تقویٰ پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ امام زُہری رحمہ اللہ اس قدر علمی ذوق رکھتے تھے کہ ہر وقت اپنے اساتذہ و طلبا اور ہم عصر علماء سے علمی مباحثے میں مصروف رہا کرتے تھے۔[1]

امام انماطی محدثِ بغداد رحمہ اللہ

آپ نے کبار علمی کتب پر تعلیقات (حواشی) کا اضافہ کیا ہے جن میں سے الطبقات لابن سعد اور تاریخ بغداد قابل ذکر ہیں۔[2]

اگر صرف انھی دو کتب کے تمام اجزاء کو جمع کیا جائے تو انسان انھیں اٹھانے سے قاصر ہوگا۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ آپ نے انھیں کس قدر محنت سے مرتب کیا ہوگا؟

امام حر بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ

آپ نے چالیس سال کا طویل عرصہ صرف لغتِ قرآن کی تعلیم پر صرف فرما دیا تھا۔

امام ابراہیم الحربی رحمہ اللہ

ابو العباس ثعلب کا ابراہیم الحربی کے بارے میں قول ہے کہ میں نے آپ کو

---

1. بستان العارفین لِلنَّووی، ص: 114. 2. التاریخ الکبیر: 82/3.

نحو ولغت کی کسی بھی مجلس میں پچاس سال میں کبھی غیر حاضر نہیں پایا۔ آپ نے میدانِ علم میں وہ مقام پایا کہ آپ کے بعض اصحاب انھیں امام احمد رحمہ اللہ سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔[1]

امام محمد بن احمد بن قدامہ رحمہ اللہ

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے بہت سی کتب کی کتابت اپنے ہاتھ سے فرمائی، مثلاً: تفسير البَغوی، المغنی، حِلية أبی نُعَيم، الإبانة لابن بطة، الخرقی۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی کتب آپ ہی کے قلم سے تحریر ہوئیں۔

امام ابراہیم الجوہری رحمہ اللہ

اگر کسی حدیث کا ایک ہی راوی ہوتا تو آپ اس کے مزید واسطے اور راوی اکٹھے کرنے کے لیے دیگر شہروں اور ملکوں کی طرف سفر کرتے اور اس کے ممکنہ دستیاب راوی واسناد کو جمع کرتے۔[2]

امام ابوالحصین الأسدی رحمہ اللہ

آپ نے خود کو تعلیم وتعلّم ہی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اپنی زندگی کا طویل عرصہ حصولِ علم میں گزارنے کے بعد آپ پچاس برس تک لوگوں کو حدیث وفقہ کی تعلیم دیتے رہے۔[3]

امام خلف بن ہشام رحمہ اللہ

آپ فرماتے ہیں کہ علم نحو کی ایک بحث میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، میں نے

---

[1] طبقات الحنابلہ: 1/89. [2] تذکرة الحفاظ: 2/516. [3] تهذيب التهذيب: 7/127.

اس کی خاطر کئی ملکوں کے سفر کیے اور کثیر وقت کے علاوہ 80 ہزار درھم کی خطیر رقم خرچ کر کے اس بحث کو سمجھا۔[1]

امام زید بن حسن الکندی رحمہ اللہ

امام ذہبی رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں کہ آپ نے صرف دس سال کی عمر میں ہی نہ صرف قرآن حفظ کر لیا تھا بلکہ قراءاتِ عشرہ کی تعلیم بھی حاصل کر لی تھی۔[2]

امام قالون رحمہ اللہ

آپ علوم قراءت میں ماہر تھے۔ قُرّاء کا جمِّ غفیر آپ کے حلقۂ درس میں حاضر رہتا۔ علی بن حسن الہسنجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''آپ کی قوتِ سماعت کمزور تھی اس لیے آپ اپنی مہارتِ قراءت کی بہ دولت قاری کے ہونٹوں کی حرکت سے ہی پہچان لیتے کہ یہ الفاظ کی ادائیگی صحیح کر رہا ہے یا غلط۔''[3]

امام عمرو بن میمون رحمہ اللہ

آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی حدیث کا مجھے علم نہ ہو اور مجھے معلوم ہو جائے کہ یمن میں کسی محدِّث کے پاس وہ حدیث موجود ہے تو میں اسے وہاں سے بھی حاصل کر لاؤں گا۔[4]

امام سعید بن عبدالعزیز رحمہ اللہ

آپ فرماتے ہیں کہ میں صبح کے اوقات میں ابن ابی مالک رحمہ اللہ کی مجلس

[1] معرفة القراء الكبار: 172/2. [2] معرفة القراء الكبار: 468/2. [3] معرفة القراء الكبار: 129/1. [4] تهذيب التهذيب: 108/8، سير أعلام النبلاء: 346/6.

میں، ظہر کے بعد اسماعیل بن عبید اللہ رحمہ اللہ کی اور عصر کے بعد مکحول رحمہ اللہ کی مجلسِ علم میں حاضر ہوا کرتا تھا۔[1]

یعنی اپنے تمام اوقات کو فقط حصولِ علم کے لیے ہی خاص کر رکھا تھا۔

امام نعیم المجمر رحمہ اللہ

آپ نے جلیل القدر صحابی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مجلسِ حدیث میں مسلسل بیس سال تک شرکت کی۔ آپ ان کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔[2]

امام عبد اللہ بن نافع رحمہ اللہ

آپ امام مالک رحمہ اللہ کی مجلسِ حدیث میں 35 سال تک شریک رہے۔[3]

امام اسماعیل الجرجانی رحمہ اللہ

آپ ہر رات میں مختلف علوم وفنون پر 90 اوراق لکھا کرتے تھے۔[4]

ان لوگوں کے عزائم اور ہمتیں پہاڑ کی طرح مضبوط ہوا کرتی تھیں۔ نہ تو انھیں عیش و آرام کی چاہت ہوتی، نہ مال و دولت کی حرص ہوتی اور نہ ہی دنیوی خواہشات ان پر غالب آتی تھیں بلکہ انھوں نے تمام تر امور سے قطع نظر ہو کر خود کو فقط تعلیم و تعلّم کے لیے وقف کر رکھا تھا اور لیل و نہار کے تمام اوقات میں اسی کام میں مشغول رہتے۔

ہر طالب علم جب حصولِ علم کے لیے صدقِ نیت کے ساتھ محنت کرنے کی

---

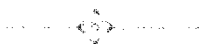
[1] سير أعلام النبلاء: 33/8. [2] سير أعلام النبلاء: 227/5. [3] سير أعلام النبلاء: 108/8.

[4] سير أعلام النبلاء: 54/13.

ٹھان لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے پیش آنے والی تمام مشکلات آسان فرما دیتا ہے، تمام رکاوٹیں دُور کر دیتا ہے اور منازل علم کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔

موجودہ دور میں حصولِ علم کے لیے بہت زیادہ وسائل وسہولیات میسر ہیں۔ ہم اگر چاہیں تو اسلاف کے طرزِ عمل کے مطابق خود کو ڈھال سکتے ہیں لیکن اس کے لیے بلند ہمتی، عزمِ صمیم، خلوصِ نیت، محنت، جدوجہد اور شوق ورغبت جیسی صفات کا ہونا ضروری ہے۔ بہ قول شاعر:

؎ شوق ہو راہنما تو کوئی چیز نہیں مشکل
مگر شوق بڑی مشکل سے راہنما بنتا ہے



حصولِ علم میں رکاوٹ پیدا کرنے والے امور

نیت کا فاسد ہونا

ہر عمل کی اساس اور بنیاد نیت ہی ہے۔ جب بھی کسی کام کے دوران نیت میں خلل واقع ہو جائے تو وہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتا اور اگر مکمل ہو بھی جائے تو فسادِ نیت کی وجہ سے اجر و ثواب کے حصول سے قاصر رہتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰى»

''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہی ہے اور ہر آدمی کو بس وہی کچھ ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی ہو۔''[1]

نیت رکن ہے اور رکن بنیاد کو کہتے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

وَالْبَيْتُ لَا يُبْتَنٰى إِلَّا بِأَعْمِدَةٍ وَلَا عِمَادَ إِذَا لَمْ تُبْنَ أَرْكَانٌ

''گھر بغیر ستونوں کے تعمیر نہیں ہوتا اور ستون بغیر بنیاد کے کھڑے نہیں ہوتے۔''

---

[1] صحيح البخاري، باب بدء الوحي، حديث:1 صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب قول النبي ﷺ إنماالأعمال بالنية، حديث: 1907.

جب فروعی اختلافات پر فتنہ وفساد پھیلانے کی یا دیگر لوگوں سے آگے بڑھنے اور خود کو دوسروں سے ممتاز رکھنے کی نیت ہو تو عمل خواہ کتنا بھی عظیم ہو اجر وثواب سے خالی رہتا ہے۔ لیکن اگر نیت درست ہو اور اچھے مقاصد پیش نظر ہوں تو اللہ تعالیٰ راہنمائی بھی فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کو نیکو کاروں میں بھی شمار فرماتا ہے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

''جو لوگ ہمارے بارے میں تگ و دو کرتے ہیں ہم بھی اپنی راہوں کی طرف ان کی راہنمائی کرتے ہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے ساتھ ہے۔''[1]

نیت میں خرابی کا پیدا ہونا شیطان کا حملہ ہوتا ہے لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، تعجب کی بات تو یہ ہے کہ انسان ایسی نیت پیدا ہونے کے بعد اس پر قائم رہے۔ حالانکہ اسے چاہیے کہ وہ جس قدر جلد ممکن ہو نیت میں پیدا ہو جانے والے مفاسد کو ختم کرنے کی کوشش کرے اور شیطانی وسوسوں کے خلاف جنگ کرے۔ چہ جائیکہ وہ ان وسوسوں کی وجہ سے مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہو جائے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے جب غیر اللہ (ذاتی مفادات اور دنیوی جاہ وحشمت) کے حصول کے لیے علم حاصل کرنا شروع کیا تو علم ہمارے دل ودماغ میں صرف اس وجہ سے نہ آ سکا کہ یہ تو فقط اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔[2]

بعض علماء نے اس قول کی تشریح یہ کی ہے کہ طالبِ علم جب خلوصِ نیت سے

---

[1] العنکبوت 29: 68. [2] تذکرة السامع والمتکلم لابن جماعة، ص: 47.

علم حاصل کرنے کے لیے نکلتا ہے تو پھر اگر شیطان اس کو اس مقدس پیشے سے انحراف کے لیے بہکانے پھسلانے کی کوشش بھی کرے تو اللہ تعالیٰ اپنی خاص اعانت و نصرت اس کے شاملِ حال کر دیتا ہے اور صحیح راستے کی طرف اس کی راہنمائی فرماتے ہوئے اسے اس کے مقصد کے حصول میں کامیاب فرماتا ہے۔ لیکن اگر اس کے باوجود بھی طالبِ علم پر شیطان کی باطل و فاسد خواہشات کا غلبہ رہتا ہے تو پھر اس کا ذمہ دار وہ خود ہی ہے اور پھر اگر وہ علم حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے تو وہ اپنی اس ناکامی پر خود ہی کو ملامت کرے۔

شہرت و امتیاز کی خواہش رکھنا

بھی نیت ہی کا معاملہ ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے الگ طور پر بیان کیا جا رہا ہے۔ لوگوں میں شہرت حاصل کرنے، احباب و رفقاء سے آگے بڑھنے، ان پر فوقیت حاصل کرنے اور ہر معاملے میں خود کو دوسروں سے ممتاز رکھنے کی تمنا ایک ایسی بیماری ہے جس سے خود کو بچانا بہت مشکل ہے، الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ محفوظ فرمالے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دورِ نبوت و خلافت کے بعد کے ادوار میں علماء و صالحین جن بیماریوں کا شکار ہوئے، ان میں سے عہدہ و منصب کی چاہ اور لوگوں پر فوقیت حاصل کرنے کی بیماری بھی تھی۔[1]

جب کسی طالبِ علم کے ذہن میں یہ خواہش جنم لینے لگتی ہے کہ اس کا نام مشہور ہو جائے، لوگوں کی زبانوں پر اس کا تذکرہ ہونے لگے اور ہر جگہ اس کا استقبال اور

[1] الاعتصام للشاطبی.

پذیرائی ہو تو دراصل ایسا طالب علم اپنی دنیوی اور اخروی زندگی کے لیے ناکامی و بربادی کا سامان تیار کر رہا ہوتا ہے جیسا کہ نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْضٰى يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلَيْهِ ثَلَاثَةٌ (إِلٰى أَنْ قَالَ) وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَ عَلَّمَهُ وَقَرَأَ الْقُرْاٰنَ فَأُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا فَعَلْتَ فِيهَا؟ قَالَ تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَ عَلَّمْتُهُ، وَ قَرَأْتُ فِيْكَ الْقُرْاٰنَ. قَالَ: كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ عَالِمٌ، وَقَرَأْتَ فِيَّ الْقُرْاٰنَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ فَقَدْ قِيْلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ»

”روزِ قیامت سب سے پہلے جن تین لوگوں کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا (ان میں سے دو کا بیان کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:) ایک شخص وہ ہوگا جس نے (دنیا میں) خود بھی علم حاصل کیا اور پھر لوگوں کو بھی تعلیم دیتا رہا اور قرآن بھی پڑھا کرتا تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا جائے گا اور اسے وہ تمام نعمتیں یاد دلائی جائیں گی (جو دنیا میں اسے حاصل تھیں) تو وہ ان کا اقرار کرے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ بتا تو دنیا میں کیا کرتا رہا ہے؟ وہ جواب دے گا: میں نے پہلے خود علم حاصل کیا، پھر دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا رہا اور میں تیری رضا کی خاطر قرآن بھی پڑھا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹ بول رہا ہے، تو نے تو علم صرف اس لیے حاصل کیا تھا کہ لوگ تجھے عالم کہیں اور تو قرآن بھی صرف اسی غرض سے پڑھا کرتا تھا کہ لوگ تجھے قاری کہہ کر

پکاریں۔ سو تجھے تیری نیت کے مطابق ویسا ہی کہا اور پکارا جا چکا ہے (اب تیرے لیے کوئی اجر و انعام نہیں ہے)، پھر اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں حکم فرمائے گا تو اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔"[1]

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ وَالشَّهْوَةُ الْخُفْيَةُ»

"جن گناہوں میں تمھارے مبتلا ہو جانے کا مجھے خدشہ ہے اُن میں سے سب سے بڑھ کر شرک اور مخفی خواہش ہے۔"[2]

ابن الأثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مخفی خواہش سے مراد لوگوں میں اپنے نیک اعمال کی تشہیر کی خواہش رکھنا ہے۔[3]

اسی طرح سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ انھوں نے حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کو اس وجہ سے جھڑک دیا تھا کہ لوگ ان کے پیچھے پیچھے چلتے تھے اور ان سے آگے نہیں بڑھتے تھے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں کو ایسا کرنے سے روکا کرو کیونکہ یہ آگے چلنے والے کے لیے آزمائش اور پیچھے چلنے والوں کے لیے ذلت کا باعث ہے۔[4]

آداب و اخلاق کی بعض کتب میں یہ بھی ذکر ہے کہ جب کوئی شخص اس بات کو پسند کرے کہ وہ جب بھی کسی مجلس میں آئے تو لوگ اس کی تعظیم کریں، اس کے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الإمارة باب من قاتل للریاء والسمعة......حدیث: 3527. [2] السلسلة الصحیحة للألباني: 508/2. [3] النهایة فی غریب الحدیث: 516/2. [4] الاعتصام للشاطبی.

استقبال کے لیے کھڑے ہوں اور اسے خوب پروٹوکول دیں تو یہ ریا کاری کے ضمن میں آتا ہے اور یہ خطرناک گناہ ہے۔

اسلاف رحمہم اللہ لوگوں میں شہرت حاصل کرنے سے ہمیشہ بچا کرتے تھے، مثلاً:

- امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں چاہتا ہوں کہ مکہ کی گھاٹیوں میں رہوں، نہ لوگ مجھ سے ملیں اور نہ میں شہرت پاؤں۔[1]
- شعبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لوگ میرا تذکرہ کرتے ہیں حالانکہ میں اس بات کو قطعاً پسند نہیں کرتا کہ لوگوں میں میرا ذکر کیا جائے۔[2]
- حماد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ایوب السختیانی رحمہ اللہ جب راہ میں چلتے تو لوگوں سے کترا کر گزر جاتے تا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ ایوبؒ جا رہے ہیں۔[3]
- بشر بن حارث رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے اسی بات سے ڈرتا ہوں کہ میں شہرت کی محبت میں گرفتار ہو جاؤں۔[4]
- امام احمد رحمہ اللہ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! مجھے ریا کاری میں مبتلا ہونے سے بچائے رکھنا۔[5]

علمی مجالس سے دور رہنا

اسلاف رحمہم اللہ فرمایا کرتے تھے کہ اَلْعِلْمُ یُؤْتٰی وَلَا یَأْتِیْ، یعنی علم کے پاس تو چل کر جانا پڑتا ہے یہ خود چل کر کسی کے پاس نہیں آتا۔ لیکن ہماری حالت اس کے برعکس ہے کہ علم تو چل کر ہمارے پاس ضرور آ جاتا ہے مگر ہم پھر بھی اسے پانے کے لیے اس کے پاس حاضر ہونے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ یہ اللہ تعالیٰ

[1] سير أعلام النبلاء: 210/11. [2] المرجع السابق: 22/6. [3] المرجع السابق: 476/10.
[4] المرجع السابق: 216/11. [5] المرجع السابق: 211/11.

کا ہم پر فضل ہے کہ آج کے اس جدید دور میں ہر شہر میں مدارس و جامعات اور علمی مراکز قائم ہیں جس کے بہ دولت ہمارے لیے علم حاصل کرنا کوئی دشوار کام نہیں رہا۔ لیکن اگر یہ سہولیات آج بھی میسر نہ ہوتیں تو ہماری سہولت پسند طبع کبھی یہ گوارہ نہ کرتی کہ حصولِ علم کے لیے دور دور کے سفر کرنے کی مشقت اٹھائی جائے۔ جس کا نتیجہ جہالت وندامت کی صورت میں ہوتا۔ ان علمی مراکز ہی کا یہ خاصہ ہے کہ یہ جہالت کی عمیق کھائیوں میں پڑے کتنے ہی لوگوں کو علم سے محروم زندگی کے اندھیروں سے نکال کر انوارِ علمی سے منوّر مجالس میں لاتے ہیں اور انھیں علوم و فنون سے روشناس کرتے ہیں۔ علمی مجالس میں حاضر ہونے والوں پر اللہ کی طرف سے سکینت نازل ہوتی ہے، اس کی رحمت انھیں ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان پر سایہ فگن ہو جاتے ہیں گویا ان علمی مجالس میں آنے والے شخص کے لیے ہر دو جہان میں خیر ہی خیر ہے۔ وہ علم حاصل کر کے دنیا میں بھی بہت سے لوگوں پر فضیلت پالیتا ہے اور رب تعالیٰ کی معرفت کے علاوہ شعوری بندگی بجالا کر اخروی ثمرات بھی سمیٹ لیتا ہے۔ گویا وہ حصولِ علم کے مقدس سفر کا راہرو بن کر اور علمی مجالس میں شریک ہو کر خزینۂ علم سمیٹنے کے علاوہ بھی دو کامیابیاں حاصل کرتا ہے، ایک: دنیا میں دیگر لوگوں پر فضیلت اور دوسری: روزِ آخرت نجات کا سامان۔

بے مقصد کاموں میں مصروف رہنا

یہ شیطان کی طرف سے حصولِ علم سے دور رکھنے کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے کہ وہ طالب علم کو فضول کاموں میں مشغول رکھتا ہے۔ کلاس میں باقاعدگی سے حاضر نہیں ہونے دیتا اور اسے دیگر کاموں میں اُلجھا کر مسلسل غیر حاضر رکھتا

ہے، جس کی وجہ سے طالب علم اپنے اس عظیم مقصد کے علاوہ ہر کام کو اہمیت دینے لگتا ہے اور انھیں حجت بنا کر تعلیم ترک کر دیتا ہے۔ اس کی یہ مصروفیات ہی اس کے لیے حصولِ علم میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہیں لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ بصیرت عطا کرے اور وہ علم حاصل کرنے کو ہی سب سے بڑی مصروفیت سمجھے، اپنے اوقات کو ترتیب دے، کلاس میں باقاعدگی سے حاضر ہو اور نظم و ضبط کے ساتھ چلے تو ایسا طالب علم اپنے مقصد میں یقیناً کامیاب ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ قولِ شاعر ہے ؎

وَمَنْ لَّمْ يُجَرِّبْ لَيْسَ يَعْرِفُ قَدْرَهُ
فَجَرِّبْ تَجِدْ تَصْدِيْقَ مَا قَدْ ذَكَرْنَاهُ

''انسان جب تک کسی بھی چیز کا تجربہ نہیں کر لیتا تب تک اس کی قدر نہیں پہچانتا، لہٰذا جو ہم نے ذکر کیا ہے تم بھی اس کا تجربہ کرو تو تمھیں بھی تصدیق ہو جائے گی۔''

بچپن میں حصولِ علم سے بے رغبت رہنا

ایسے لوگ قابلِ رشک ہوتے ہیں جو کم سنی ہی میں بلند ہمت اور عزم صمیم کے مالک ہوتے ہیں اور چھوٹی عمر سے ہی علمی مجالس میں شریک ہونے لگتے ہیں لیکن جو لوگ بچپن میں حصولِ علم میں سستی کرتے ہیں اور اسے جوانی کی عمر پر ٹال رکھتے ہیں تو ایسے لوگ بعد میں اپنے گزرے وقت پر کفِ افسوس ملتے ہوئے نادم و پشیمان ہوتے ہیں کہ کاش! وہ بھی گزرے ہوئے وقت میں کچھ کر لیتے، اس لیے کہ جو سیکھنے اور یاد کرنے کی قوت بچگانہ ذہن میں ہوتی ہے وہ بڑے ہو کر قطعاً

حاصل نہیں ہو پاتی کیونکہ بچے کو سوائے پڑھائی کے اور کوئی کام نہیں ہوتا، وہ اپنی تمام تر توجہ اسی کام پر مرکوز رکھتا ہے اور جو بھی اسے سکھایا جائے وہ مکمل انہماک کے ساتھ اسے سیکھتا ہے، پھر جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے توں توں اس کے مشاغل میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور جوان ہوجانے کے بعد تو اس کے مشاغل و مصروفیات اس قدر بڑھ جاتی ہیں اور اس پر اتنی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں کہ ان کی وجہ سے وہ دن رات دیگر کاموں سے ہی فارغ نہیں ہو پاتا، چہ جائیکہ وہ تعلیم کے لیے وقت نکالے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ علم سے بے بہرہ رہ جاتا ہے اور مجبوراً یا عمداً جہالت کی زندگی گزارتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بچپن ہی سے تعلیمی عمل کے ساتھ منسلک ہوا جائے کیونکہ بچپن میں حاصل کیا ہوا علم بدرجہا بہتر اور تا عمر مفید رہتا ہے جیسا کہ امام حسن رحمہ اللہ کا قول ہے:

طَلَبُ الْحَدِيْثِ فِي الصِّغَرِ كَالنَّقْشِ فِي الْحَجَرِ .

''بچپن میں علم حدیث کا حصول پتھر پر نقش کی طرح ہوتا ہے۔''[1] یعنی تاحیات ثابت رہتا ہے، کبھی مٹ نہیں پاتا۔

چنانچہ ضروری ہے کہ کم سنی کے وقت کو غنیمت جان کر علم کے سفر پر گامزن ہوا جائے کیونکہ اس وقت سیکھنے اور یاد کرنے کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور فارغ البال ہونے کی وجہ سے ذہن بھی صرف پڑھائی ہی کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ لیکن اگر عدمِ راہنمائی یا کسی مرض و عذر کی وجہ سے انسان بچپن میں علم حاصل نہ کر سکا ہو اور جوانی یا بڑھاپے کی عمر میں اسے احساس اور شوق بیدار ہوتا ہے تو تب بھی اسے ہرگز مایوس و نا امید نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنے قیمتی وقت کا ایک بھی لمحہ ضائع کیے

[1] جامع البیان العلم وفضلہ، ص: 99.

بغیر فوراً حصول علم کے لیے کمر بستہ ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ ایک حقیقی مسلمان کی تو ساری عمر ہی حصولِ علم میں گزرتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر لمحے میں دین وشریعت کی معرفت کی باتیں سیکھتا رہتا ہے کیونکہ یہ بھی تو عبادت ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ سے فرماتا ہے:

﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾

''اپنے پروردگار کی عبادت کیجیے یہاں تک کہ آپ کو موت آ جائے۔''[1]

تعلیم میں دلچسپی نہ لینا

تعلیم کا مقصد واضح اور متعین نہ ہو تو حصولِ علم میں دلچسپی اور شوق پیدا نہیں ہوتا۔ نصاب و نظامِ تعلیم کی یہ سب سے بڑی خامی ہے۔ یہ سبب اور خامی موجود ہو تو حصولِ علم میں رغبت ختم ہو جاتی ہے، یعنی کلاس میں حاضر نہ ہونا، یا حاضر تو ہونا مگر اسباق میں دلچسپی نہ لینا، یا اسباق کو سننا اور یاد نہ رکھنا، یا آج کا کام کل پر ٹال رکھنا، یا نصابی کتب کے بہ جائے غیر نصابی کتب و رسائل کے مطالعے کا غیر معمولی شوق رکھنا۔ یہ تمام عوامل عملِ تعلیم کو شدید متأثر کرتے ہیں۔ دورانِ تعلیم اس کا احساس نہیں ہو پاتا۔ اس کا احساس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس وقت ہوتا ہے جب ہم عصر لوگ تعلیم سے فراغت پا کر اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی اور اس طرف پیش قدمی کر چکے ہوتے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

إِذَا أَنْتَ لَمْ تَزْرَعْ وَ أَبْصَرْتَ حَاصِدًا

نَدِمْتَ عَلَى التَّفْرِيْطِ فِيْ زَمَنِ الْبَذْرِ

---

[1] الحجر 15:99.

”جب آپ نے بیج ہی نہیں بویا تو کٹائی کے دنوں میں فصل کے پکنے اور کاٹنے کی اُمید لگانا، اپنی سستی پر شرمندہ ہونے کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

خودستائی کو پسند کرنا

حصولِ علم میں یہ بات بھی آڑ بنتی ہے کہ طالب علم اپنی تعریف وستائش کو پسند کرے، یا یہ خواہش رکھے کہ اس کے نام کے ساتھ بہت سے القابات لگائے جائیں، یا اس بات سے اسے خوشی محسوس ہوتی ہو کہ اس کا تذکرہ زبان زدِ عام ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کے کسی بھی اچھے عمل کی جب لوگ تعریف کرتے ہیں تو یہ بھی اس کے لیے اس عمل کا ثمرہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے شخص کے متعلق سوال کیا کہ جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں (البتہ وہ خود تعریف کروانا پسند نہ کرتا ہو) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ»

”یہ مومن کو اس نیکی کا دنیا میں ملنے والا صلہ ہے۔“[1]

لیکن خود اس بات کو پسند کرنا کہ میری تعریف کی جائے یا خود ہی لوگوں کے سامنے اپنی قابلیت اور صاحبِ علم ہونے کا تذکرہ کرنا، حالانکہ وہ اس قابل بھی نہ ہو، انتہائی مذموم عمل ہے۔

اللہ تعالیٰ ایسے عمل کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿يُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُم بِمَفَازَةٍ مِّنَ

[1] صحیح مسلم، کتاب البر، باب اذا اثنی علی الصالح فھی بشری، حدیث: 4780.

الْعَذَابِ الْأَلِيْمِ ﴾

''وہ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کے نا کردہ کاموں پر بھی ان کی تعریف کی جائے تو آپ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ انھیں عذابِ الیم سے چھٹکارا مل جائے گا۔''[1]

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس خصلتِ رزیلہ کے مرتکب لوگوں کو عذابِ الیم کی وعید سنائی ہے، البتہ یہاں ایک بات ملحوظ رہے کہ اگر کوئی شخص نیک اور متقی ہو، باصلاحیت ہو اور خودستائی کو پسند بھی نہ کرتا ہو تو اگر وہ کسی نیک ارادے سے کسی کام کے کرنے کے لیے اپنی اہلیت بیان کرتا ہے تاکہ کسی برے اور نااہل شخص کے بہ جائے وہ کام اسے سونپ دیا جائے اور وہ اپنی صلاحیت اور اہلیت کو بروئے کار لا کر لوگوں کی مدد کر سکے تو ایسا شخص اس وعید میں داخل نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے واقعے میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ علیہ السلام نے بادشاہِ وقت کے سامنے فرمایا:

﴿ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ﴾

''مجھے زمین کے خزانوں پر نگہبان مقرر کر دیجیے۔ یقیناً میں (ان کی بہتر نگہبانی کرنے والا اور (ان کے متعلق) علم رکھنے والا ہوں۔''[2]

یہ خودستائی نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام (صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین) کو دنیا میں جس مقصد کے لیے بھیجا تھا اُس کا لازمی تقاضا تھا کہ جیسے ہی موقع ملے آگے بڑھ کر انسانی معاشرے میں اقتدار و حکومت کے اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تاکہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے احکام جاری کرنے، دینِ حق کا نفاذ کرنے اور عدل و انصاف کا نظام رائج کرنے میں اقتدار کے ذرائع اور وسائل کو

[1] آل عمران 18:83. [2] یوسف 55:12.

استعمال میں لاسکیں۔

لیکن زیادہ تر خودستائی شیطانی حملہ ہوتا ہے جس سے حتی الامکان بچنا ضروری ہے۔ جب لوگ آپ کے نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کی تعریف وستائش کریں تو آپ کو اپنے گناہوں، خصوصاً مخفی عیوب پر نظر دوڑانا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ اگر میرے ان تمام گناہوں اور کوتاہیوں کا ان لوگوں کو علم ہو جائے تو ان کا میرے متعلق کیا تأثر ہو گا۔ آپ کا یہ عمل لوگوں کے تعریف وستائش کرنے سے آپ کے دل میں شیطانی وسوسہ اور کبر و بڑائی نہیں پیدا ہونے دے گا اور آپ خود بخود عجز و انکساری اختیار کرنے لگیں گے۔

علم پر عمل نہ کرنا

علم پر عمل نہ کرنا علم کی برکات کے زائل ہونے کا سبب ہے اور روزِ قیامت یہ عمل اس شخص کے خلاف حجت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایسے عمل سے یوں متنبہ فرمایا ہے:

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

''اللہ کے ہاں یہ بہت بڑا جرم ہے کہ تم لوگوں کو جو بات کہو خود اس پر عمل نہ کرو۔''[1]

اسلاف رحمہم اللہ جس شوق و رغبت اور محنت سے علم حاصل کرتے، اس پر عمل کرنے کے لیے اس سے بھی کہیں بڑھ کر حریص رہتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم میں سے کوئی شخص جب دس آیات سیکھ لیتا تو اس وقت تک

[1] الصف 61:3.

آگے نہ بڑھتا جب تک ان دس آیات کے معانی و مفاہیم کو خوب سمجھ نہ لیتا اور ان میں بیان کیے گئے احکامات پر عمل نہ کر لیتا۔[1]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ علم انسان کی عملی کیفیت دیکھتا ہے۔ اگر وہ اس پر عمل کرتا ہو تو پھر وہ انسان کے دل میں سکونت اختیار کر لیتا ہے لیکن اگر وہ اس پر عمل نہ کرتا ہو تو علم اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔[2]

معلوم ہوا کہ علم اور عمل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر دونوں کا وجود ہو تو حصولِ برکات اور رفعت و نجات کا باعث بنتا ہے اور اگر علم تو ہو لیکن اس پر عمل نہ ہو تو یہی علم انسان کے لیے وبال بن جاتا ہے۔

بشر الحافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بغیر عمل کے دو سو احادیث کا علم حاصل کرنے سے عمل کے ساتھ پانچ احادیث کو ہی سیکھ لینا بہتر ہے۔[3]

علم پر عمل کرنا علم کی مزید پختگی اور رسوخ کا بھی سبب بنتا ہے، لہٰذا جب آپ اپنے علم میں اضافہ اور پختگی پیدا کرنا چاہیں تو پھر حصولِ علم کے ساتھ عملی صورت حال کو بھی بہتر بنائیں، فرائض کے علاوہ نوافل کا بھی اہتمام کریں، تہجد پر باقاعدگی اختیار کریں اور مسنون دعاؤں اور صبح و شام کے اذکار کو اپنا معمول بنائیں کیونکہ اگر انسان حاصل کیے جانے والے علم پر ساتھ ساتھ عمل بھی کرتا رہتا ہے تو حصولِ اجر و مغفرت کے علاوہ وہ علم بھی اس کے ذہن میں راسخ اور منقّش ہو جاتا ہے لیکن اگر انسان عمل میں کوتاہی کرتا رہے تو جہاں وہ اس کے لیے باعثِ وبال بن جائے گا وہاں وہ علم تا دیر اسے یاد بھی نہیں رہ پاتا بلکہ بہت جلد

---

[1] تفسیر ابن کثیر: 1/2. [2] ابن عبدالبر فی الجامع: 1/11. [3] ادب الإملاء والإستملاء، ص: 110.

اسے بھول جاتا ہے۔

دین کا علم ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت اور لازوال دولت ہے۔ اس دولت کی بھی مال کی طرح زکاۃ ادا کرنا واجب ہے اور اس کی زکاۃ اس پر عمل کرنا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دینا ہے جیسا کہ شیخ الدعوۃ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إِعْلَمْ رَحِمَكَ اللّٰهُ! أَنَّهُ يَجِبُ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةٍ تَعَلُّمُ أَرْبَعَ مَسَائِلٍ: اَلْأُوْلٰى: اَلْعِلْمُ، اَلثَّانِيَةُ: اَلْعَمَلُ بِهٖ، اَلثَّالِثَةُ: اَلدَّعْوَةُ إِلَيْهِ، اَلرَّابِعَةُ: اَلصَّبْرُ عَلَى الْأَذٰى فِيْهِ.

''اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے! جان رکھو کہ چار مسائل کو اچھی طرح جاننا ہر مسلمان مرد و عورت پر واجب ہے: پہلا: علم حاصل کرنا، دوسرا: اس علم پر عمل کرنا، تیسرا: اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا، چوتھا: اس دعوت میں پیش آنے والی تکالیف پر صبر کرنا۔''[1]

نا اُمیدی اور احساسِ کمتری کا پیدا ہونا

اے متلاشیانِ علم! میں اور آپ امام بخاری، ابن تیمیہ، ابن حجر رحمہم اللہ اور دیگر تمام ائمہ واسلاف، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مشترک ہیں:

﴿ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾

''اللہ تعالیٰ نے تم سب کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے (ایک جیسا ہی) نکالا

[1] الاصول الثلاثة للشيخ محمد بن عبدالوهاب.

ہے، تم کچھ بھی علم نہیں رکھتے تھے اور اس نے تمھیں سماعت و بصارت اور (سوچنے سمجھنے کے لیے) دل عطا کیے تاکہ تم شکر ادا کر سکو۔"[1]

اس آیت میں تمام لوگ یعنی انبیاء و رسل علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین و اسلاف رحمہم اللہ اور ہم سب شامل ہیں۔ تمام لوگوں کا اوّلاً یکساں مقام ہوتا ہے اور انسان ہونے کے ناطے سب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ کسی کو دوسرے پر فوقیت و مرتبہ حاصل نہیں ہوتا، پھر جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا محبوب و مقرّب ٹھہرایا اور اپنے لیے چن لیا تو اسے انبیاء و رُسل علیہم السلام کی صف میں شامل فرما لیا۔ اور جو کسی نبی و رسول کا رفیق بن گیا تو اس کا نام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فہرست میں لکھ دیا گیا۔ ان کے بعد جس شخص نے خیر القرون کو پایا اللہ تعالیٰ نے انھیں تابعین، تبع تابعین اور ائمہ و اسلاف رحمہم اللہ کا مقام عطا فرمایا۔

ہمیں اس بات کو پیش نظر رکھ کر غور کرنا چاہیے اور اس بات کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر امام بخاری رحمہ اللہ اپنی پیدائش کے وقت علم حدیث سے قطعًا ناواقف و لاعلم تھے اور انھوں نے شوق و رغبت، محنت و ریاضت اور انتہائی جدوجہد کے بدولت امیر المؤمنین فی الحدیث کا مقام حاصل کر لیا تو وہی شوق و جذبہ اگر ہم بھی پیدا کر لیں تو کچھ بعید نہیں ہے کہ ہم بھی علمی حلقوں میں ایک بلند مقام حاصل کر لیں۔ اگر آپ کا حافظہ کمزور ہو، فہم میں ضعف ہو، اسباق جلد یاد نہ ہوتے ہوں یا پھر یاد کر کے بھول جانے کا مسئلہ ہو تو قطعًا مایوس و ناامید نہ ہوں اور نہ ہی خود کو کمتر سمجھیں کیونکہ یہ تمام عارضی وجوہات ہوتی ہیں۔ ان پر اخلاصِ نیت، عزمِ صمیم اور محنت سے قابو پایا جا سکتا ہے، چنانچہ کبھی بھی مایوسی کو خود پر سوار مت ہونے دیں بلکہ ڈٹ کر

[1] النحل 16:78.

اس کا مقابلہ کریں اور سخت محنت کر کے کوتاہیوں کو دور کریں۔

امام عسکری رحمہ اللہ اپنے شیخ سے حکایت نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک شیریں کلام اور حسن بیان کے مالک ایسے شخص کو دیکھا کہ جس کے لیے ابتدا میں گفتگو کرنا نہایت مشکل تھا لیکن اس نے آہستہ آہستہ عمدہ اور خوب صورت لہجے میں گفتگو کرنا سیکھ لیا۔ تو انھوں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ میں ہر روز جاحظ کی کتب کے کم از کم پچاس اوراق ضرور پڑھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس قابل ہوا ہوں جو آپ دیکھ رہے ہیں۔[1]

اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ نسیان (سبق بھول جانے) کا کیا علاج ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

مُدَاوَمَةُ النَّظَرِ فِی الْکِتَابِ.

''کتب بینی مستقل ہونی چاہیے۔''

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ گناہوں کو ترک کرنے سے بھی حافظہ قوی ہو جاتا ہے جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے بہت عمدگی سے یہی بات بیان فرمائی ہے ۔

شَکَوْتُ إِلٰی وَکِیْعٍ سُوْءَ حِفْظِی فَأَرْشَدَنِیْ إِلٰی تَرْكِ الْمَعَاصِیْ

وَقَالَ اِعْلَمْ بِأَنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ وَنُوْرُ اللّٰهِ لَایُؤْتَاهُ لِعَاصِیْ

''میں نے (اپنے استاذ) وکیع رحمہ اللہ کو اپنے کمزور حافظے کی شکایت کی تو انھوں نے مجھے گناہوں کو چھوڑ دینے کی ہدایت کی اور فرمایا: یاد رکھو! علم نور ہے اور اللہ تعالیٰ کا نور کسی گنہگار شخص کو عطا نہیں کیا جاتا۔''

[1] الحث علی طلب العلم : ص 72.

آج کا کام کل پر چھوڑ رکھنا

انسان یہ سوچ کر علم حاصل نہ کرے، یا اپنے اسباق پر صحیح طور پر توجہ نہ دے اور یاد نہ کرے کہ ابھی تو بہت عمر باقی ہے اور اسی امید پر وہ اپنا قیمتی وقت ضائع کرتا رہے اور حصولِ علم کو آنے والے وقت پر ٹال رکھے حالانکہ اسے یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ اس کی عمر کتنی ہے اور نہ جانے کب اس کی زندگی اسے داغِ مفارقت دے جائے، اس کے باوجود وہ کل کی اُمید لگائے ہوتا ہے۔ اسی کے متعلق ایک شاعر نے کہا:

وَلَا تَرْجُ عَمَلَ الْيَوْمِ إِلٰى غَدٍ   لَعَلَّ غَدًا يَأْتِيْ وَأَنْتَ فَقِيْدٌ

''آج کے کام کو کل مکمل کرنے کی کبھی اُمید مت لگاؤ، ممکن ہے کہ جب کل آئے تو تم ہی نہ رہو۔''

سلف صالحین کے نزدیک انسان کو علم سے دور اور جہالت میں غرق رکھنے کے لیے ایسی سوچ پیدا کرنا شیطان کا بہت بڑا حملہ ہوتا ہے۔[1]

ابو اسحاق رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص سے کسی آدمی نے وصیت کرنے کو کہا تو وہ کہنے لگا:

''عنقریب'' کہنے سے بچو، یعنی کسی بھی کام کو یہ کہہ کر مت ترک کر دو کہ میں عنقریب یہ کر لوں گا بلکہ آج کا کام آج ہی پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ۔''[2]

امام حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''آج کے کام کو کل پر مت چھوڑو کیونکہ درحقیقت تم آج ہی ہو، کل نہیں

[1] اقتضاء العلم العمل للخطيب البغدادي، ص: 114. [2] اقتضاء العلم العمل للخطيب البغدادي، ص: 114.

رہو گے اور اگر بالفرض تم (آنے والے) کل کو پا بھی لو تو تم اس کو بھی ویسے ہی ضائع کر دو گے جیسے آج کو ضائع کیا۔ لیکن اگر تم کل تک زندہ ہی نہ رہے تو پھر تمھیں گزرے کل پر پچھتانے کا بھی موقع نہیں مل سکے گا۔''

یوسف بن اسباط رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ محمد بن سمرہ رحمہ اللہ نے مجھے خط لکھا اور یہ نصیحت فرمائی کہ کام کو اُس کے وقت ہی پر نمٹا دیا کرو اور اسے کبھی بھی آئندہ دنوں پر مت چھوڑ رکھو۔ اگر تم ہر کام کو اس کے وقت پر کرنے کی عادت اپنا لو گے تو اپنے کام کا نتیجہ اور پھل بھی وقت پر پا لو گے اور اگر کام کی تکمیل میں تاخیر کرو گے تو ہوسکتا ہے کہ تاخیر سے کیے گئے کام کا مثبت نتیجہ نکلنے کے بجائے کوئی نقصان اٹھانا پڑ جائے اور یہ نقصان وقت کو ضائع کرنے کا نتیجہ ہوگا، جو حسرت و ندامت کے سوا کچھ اور نہ ہوگا۔[1]

بعض طلبہ تعلیمی عمل کو ٹالتے رہتے ہیں کہ اس سبق کو فلاں وقت یاد کروں گا، یا اس کتاب کا فلاں دن مطالعہ کروں گا۔

ایسے طلبہ اپنی عدمِ توجہ اور سستی کے باعث نصابی کتب کو پڑھ نہیں پاتے اور عبث کاموں میں مشغول رہنے کی وجہ سے تعلیمی عمل کو مؤخر کرتے رہتے ہیں۔ شیطان طرح طرح کے اوہام و وساوس پیدا کر کے انھیں علم سے دور رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ حصولِ علم کے لیے اہلِ علم کے اوصاف اپنائے اور اپنے قیمتی اوقات کا ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرے۔

[1] اقتضاء العلم العمل للخطيب البغدادي، ص: 114.

طالب علم اور حسد

حسد کی ممانعت و مذمت

حسد درحقیقت ایسی آفت ہے جس سے علم کی برکت ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے پیغمبر ﷺ کو جن منکرات سے پناہ مانگنے کا حکم فرمایا ان میں یہ بھی تھا کہ:

﴿ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ﴾

''اور حسد کرنے والے کے شر سے (میں پناہ مانگتا ہوں) جب وہ حسد کرے۔''[1]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴾

''کیا وہ ان لوگوں سے حسد کرتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمایا۔ ایسے ہی ہم نے آل ابراہیم کو کتاب وحکمت (کا علم) عطا فرمایا اور عظیم بادشاہت سے نوازا۔''[2]

---

[1] الفلق 113:5. [2] النساء 4:54.

اسی ضمن میں نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا تَحَاسَدُوْا»

''تم ایک دوسرے سے حسد مت کرو۔''[1]

حسد کے نقصانات

حسد سے ممانعت کے بعد اس کے نقصان کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ»

''یقیناً حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو بھسم کر دیتی ہے۔''[2]

اس کے علاوہ حسد ایک ایسا لا علاج مرض ہے جس سے بچاؤ میں غفلت برتی جائے تو یہ جس دل میں پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور اس دل کو تعصب، نفرت اور اخلاقی برائیوں کی آماج گاہ بنا دیتا ہے، چنانچہ جو دل محبت اور اخلاق سے عاری ہو جاتا ہے وہ کبھی نورِ علم سے منور نہیں ہو پاتا۔

دلوں میں بغض و عداوت پیدا کرنے والے دیگر تمام اسباب میں سے سب سے بڑا سبب حسد ہے۔ حسد سے جنم لینے والی عداوت کا سدّ باب بہت مشکل ہوتا ہے، جیسا کہ قولِ شاعر ہے:

كُلُّ الْعَدَاوَاتِ قَدْ تُرْجَى مَوَدَّتُهَا   إِلَّا عَدَاوَةَ مَنْ عَادَاكَ مِنْ حَسَدٍ

[1] صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم الظن..... [2] سنن ابوداود، كتاب الأدب، باب في الحسد، حديث: 4903، ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الحسد، حديث: 4210.

''تمام دشمنیوں کے ختم ہونے کی اُمید تو کی جا سکتی ہے مگر حسد کے سبب ہونے والی دشمنی ختم نہیں ہوتی۔''[1]

حسد طبعی آفت ہے

انسان کمزور طبع کا مالک ہے، جہاں اسے اور بہت سی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں وہاں ایک بیماری حسد بھی ہے جو ہر انسان میں طبعی طور پر پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ کسی نیک کام کے متعلق ہو تو یہ رشک کہلاتا ہے جو قابلِ تعریف ہے اور اگر کسی عام یا برے کام کے متعلق ہو تو حسد کہلاتا ہے جو قابلِ مَذَمَّت ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مَا خَلَا جَسَدٌ مِنْ حَسَدٍ وَلٰكِنَّ الْكَرِيْمَ يُخْفِيْهِ وَاللَّئِيْمَ يُبْدِيْهِ.

''کوئی بھی شخص حسد سے پاک نہیں ہوتا، البتہ عقل منداور باعزت شخص اسے چھپائے رکھتا ہے اور نادان و کمینہ شخص اس کا اظہار کر دیتا ہے۔''[2]

حسد...... قضائے الٰہی پر اعتراض

حاسد اگر تھوڑا سا بھی غور کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ وہ اس عملِ بد کے ارتکاب سے اللہ کے فیصلے اور تقدیر پر اعتراض کرتا ہے۔ وہ زبانِ حال سے کہتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو یہ نعمت عطا کی ہے تو میں اس کا حق دار کیوں نہیں ہوں؟ تو گویا اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے معاملات میں دخل اندازی اور اس کے فیصلوں پر اعتراض کے مترادف ہے، جیسا کہ قولِ شاعر ہے:

---

[1] كشف الخفاء: 1/272. [2] مجموع الفتاوىٰ: 10/124.

أَلَا قُلْ لِمَنْ كَانَ لَكَ حَاسِدًا تَدْرِيْ عَلٰى مَنْ أَسَأْتَ الْأَدَبَ
أَسَأْتَ عَلَى اللّٰهِ فِيْ فِعْلِهٖ لِأَنَّكَ لَمْ تَرْضَ لِيْ مَا وَهَبَ

''جو شخص تجھ سے حسد کرتا ہے تُو اسے کہہ کہ کیا تو جانتا ہے کہ تو نے کس قدر بے ادبی کی ہے؟ تو نے اللہ تعالیٰ کے معاملات میں دخل اندازی کر کے گناہ کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہے تو اس پر راضی نہیں ہے۔''[1]

حسد کی علامات

حسد کی علامات حسبِ قوت بڑھتی اور کم ہوتی رہتی ہیں، البتہ چند علامات یہاں ذکر کیے دیتے ہیں:

- اپنے ساتھی کی غلطی پر خوشی کا اظہار کرنا، حسد کی علامت ہے۔ یہ گناہ کسی غیر کی غلطی پر خوشی کے اظہار سے بڑھ کر ہے کیونکہ آپ کا ساتھی، دوست، ہم مکتب اور ہم سفر آپ سے خیر و بھلائی کی توقع رکھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میرا دوست میرے متعلق بُرا نہیں سوچ سکتا اور اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے گی تو وہ میری اصلاح کرے گا، چنانچہ اس صورت کے پیش نظر اگر بجائے اصلاح کے خوشی کا اظہار کیا جائے اور اسے دوسروں کی نظر میں خود سے نیچا دکھانے کے لیے اس کی غلطی کو خوب اُچھالے اور پرچار کرے تو یقیناً یہ حسد کی علامت اور بہت بڑا گناہ ہے۔
- اگر کوئی اور طالب علم اس کے ساتھی کی بے عزتی یا توہین کرتا ہے تو وہ اس کو اس عمل سے روکنے کے بجائے خوشی کا اظہار کرتا ہے بلکہ حاشیہ برداروں کے طور پر

[1] سبل السلام شرح بلوغ المرام: 189/13.

خود بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے۔

- اگر کسی علمی مجلس یا درس وسبق میں اس کا ساتھی کسی وجہ سے حاضر نہیں ہو پاتا تو وہ اس کے اس علمی نقصان پر خوش ہوتا ہے اور خود کو اس سے بہتر وافضل گردانتے ہوئے اس کو علمی لحاظ سے خود سے کمتر خیال کرنے لگتا ہے۔
- اگر اس کا ساتھی اس سے کسی مسئلے، کام یا کسی شخص کے متعلق استفسار کرے تو وہ اس کو حقیر جانتے ہوئے یا تو اس کا جواب ہی نہیں دیتا، یا پھر اس سے تمسخر کرتا ہے اور صحیح راہنمائی نہیں کرتا۔
- اگر اس کے سامنے اس کے ساتھی سے استاذ یا کوئی طالب علم کسی سبق کے متعلق سوال کریں تو وہ بہت ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی اور سے کیوں سوال کیا جا رہا ہے۔
- اگر اس کا ساتھی کسی سبق میں استاذ کو کسی نئے مسئلے یا بحث کی طرف توجہ دلاتا ہے تو اس کے ماتھے پر شکن پڑ جاتے ہیں کہ یہ مجھ سے آگے کیوں بڑھ رہا ہے، پھر یا تو وہ دل ہی دل میں کڑھن کا شکار ہو رہتا ہے، یا پھر یاوا گوئی سے اعتراض کر کے اس کے سوال کو فضول ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
- اگر اس کا ساتھی کوئی گفتگو کرے تو وہ اس میں غلطیاں اور خامیاں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے اور بے ہودہ اعتراضات سے اس کی گفتگو کو ردّ کرنے کی یا پھر تاویلات وتوجیہات کا سہارا لے کر اس کی گفتگو و بحث کو فضول و بے فائدہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
- اپنے ہم مکتب ساتھی کی خوبیوں اور فضائل کو عمداً بیان نہ کرنا اور اگر کوئی بیان کرے تو اسے روکنا یا خوبیوں کو خامیوں کا رنگ دینے کی کوشش کرنا بھی حسد

کی علامت ہے۔ انسان ایسا تب ہی کرتا ہے جب اسے اپنے سوا کوئی دوسرا خوبیوں کا حامل نظر نہ آتا ہو اور اگر کوئی ہو تو اسے گوارہ نہ ہو، یہ حسد کی بہت بڑی علامت ہے۔

حسد کا علاج

اوّلاً تو حسد کا مرض لاحق ہونے سے حتی الامکان خود کو بچانا چاہیے۔ لیکن اگر دانستہ یا نادانستہ کوئی طالب علم اس مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر اس کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے سے قبل ہی اس کا علاج کر لینا چاہیے۔ حسد کے علاج کی چند صورتیں یہ ہیں:

1. اپنے ہم مکتب ساتھیوں کی موجودگی اور عدم موجودگی میں اُن کی کامیابی، ترقی اور علم وعمل میں برکت کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے کیونکہ کسی کے لیے غائبانہ دعا فوراً قبول ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ اس سے اپنے ساتھیوں کے لیے دل میں محبت و چاہت جنم لیتی ہے، حسد کا قلع قمع ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کے دوستوں کے دلوں میں آپ کی عزت اور مقام پیدا فرما دیتا ہے۔
2. اپنے دوستوں سے میل جول رکھنا، ان کی خوشی وغم میں شریک ہونا اور ان کے احوال وغیرہ کا علم رکھنا چاہیے۔ جہاں یہ خوش خلقی اور محبت بڑھانے کا ذریعہ ہے وہاں یہ حسد کا بھی مؤثر اور کامیاب علاج ہے۔ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

مَنْ عَادَ مَرِيْضًا أَوْ زَارَ أَخًا لَهُ فِي اللّٰهِ نَادَاهُ مُنَادٍ أَنْ بَوَّأْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلًا .

"جو شخص فقط رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر کسی بیمار کی عیادت کرتا

ہے یا اپنے مسلمان بھائی سے ملنے جاتا ہے تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) ایک پکارنے والا یہ پکار لگاتا ہے کہ تو نے جنت میں ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔"[1]

- اگر کسی درس وسبق یا کسی مسئلے پر آپس میں بحث ہو جائے تو اس صورت میں بھی احسن انداز کو ملحوظ رکھنا چاہیے، یعنی پہلے اپنے مخاطب کی گفتگو اور مؤقف کو صبر و تحمل سے سننا چاہیے اور پھر دلائل کے ساتھ اس کا جواب دینا چاہیے۔ لیکن اگر آپ اس کا جواب دینے سے قاصر ہوں تو وسعتِ ظرفی سے اس کے مؤقف کو قبول کر لینا چاہیے تاکہ محبت ووقار برقرار رہے اور حسد کی چنگاری بھڑک نہ سکے جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴾

"برائی کو احسن انداز سے ختم کرو کیونکہ اس سے تمھارا دشمن بھی تمھارا پکا دوست بن جائے گا۔"[2]

- اپنے ساتھی کے متعلق نہ تو خود کبھی غیبت و بدگمانی کرنی چاہیے اور نہ ہی دیگر ساتھیوں سے اس کے متعلق ایسا کچھ سن کر خوش ہونا چاہیے۔ اپنے ہم مکتب کے ساتھ ایسا رویّہ رکھنا، انتہائی گھٹیا حرکت ہے، اس عملِ بد سے بچنا چاہیے بلکہ دیگر افراد کو بھی اس سے باز رہنے کی تلقین کرنی چاہیے۔

- کسی بھی اچھے، مفید اور نیک کام میں اپنے ساتھیوں کو اپنی ذات پہ ہمیشہ ترجیح دینی چاہیے نہ کہ مفاد پرست لوگوں کی طرح خود ہی کو مقدم رکھنا چاہیے، بلکہ اپنے

---

[1] صحیح الجامع: 109/12. [2] حٰمٓ السجدة 34:41.

ہم مکتب ساتھیوں کی محبت اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اپنے دل میں ایثار کا جذبہ ہر دم بیدار رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مومنین کی دیگر صفات کے ساتھ یہ امتیازی صفت بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ خود بدحال رہ کر بھی دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں۔

● اپنے معاملات میں ساتھیوں سے مشاورت کر لینی چاہیے اور ان کے پند و نصائح کو قبول کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے ایک تو ہر معاملہ درستگی و اصلاح سے پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے اور دوسرا یہ کہ اپنے ساتھیوں سے پیار ومحبت بڑھتا ہے اور ان کے دلوں میں بھی آپ کے لیے اخوت و اپنائیت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسروں سے مشورہ لینے سے ان کی تعظیم وتکریم ہوتی ہے، حسد کی بیخ کنی ہوتی ہے اور اپنے اخلاق وکردار کی بھی اصلاح ہوتی ہے۔

اَسلاف کے چند تابناک نقوش

اب ہم اسلاف کرام رحمہم اللہ کے چند واقعات تحریر کریں گے، جن سے طلبہ کو علم ہوگا کہ وہ کس طرح سے آپس میں خلوص ومحبت سے پیش آتے اور آداب و ایثار کا اہتمام کرتے ہوئے حسد کی پرچھائی تک خود پہ پڑنے نہیں دیتے تھے۔

◆ ایک شخص نے سیدنا ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں خواب دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے اور تمام لوگ ایک مقام پر اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تمام لوگوں میں ممتاز اور نمایاں نظر آرہے ہیں۔ اس نے لوگوں سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ کو یہ فضیلت اور مقام حسنِ خلافت اور عمدہ حکمرانی کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ صبح ہوئی تو وہ شخص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے ساتھ خلیفۂ اوّل حضرت

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تشریف فرما تھے۔ اس نے اپنا خواب بیان کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت غضب ناک ہوئے اور اسے وہاں سے اٹھا دیا اور چلے جانے کا حکم دیا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ انھوں نے خلیفۂ اول سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبے کے منافی ہونے کی وجہ سے اس خواب کو ناگوار سمجھا کہ کوئی شخص خلیفہ اول کی موجودگی میں آپ کی تعریف کرے۔

❁ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بعض مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فتویٰ لیا کرتے تھے، یعنی وہ خلیفہ وحکمران ہونے کے باوجود اس بات میں کوئی عار یا تعجب نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اپنی رعایا میں سے کسی سے دینی معاملات میں راہنمائی لیں۔ یہ ان کے عجز و انکسار کی درخشندہ مثال ہے۔[1]

❁ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا کسی مسئلے میں اختلاف ہوگیا۔ یہ دیکھ کر ایک شخص حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے متعلق زبان درازی کرنے لگا کہ اس نے آپ کے ساتھ ایسا ویسا کیا ہے، لہٰذا آئندہ آپ اس کو اس کے حال پر ہی چھوڑ دیں اور اس سے قطع تعلق ہو جائیں۔ یہ سنتے ہی حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس کو خوب جھڑکا اور فرمایا کہ تیری اس کم عقلی کی وجہ سے میں اپنے بھائی کے احترام میں اس اختلاف کو ابھی ختم کرتا ہوں۔[2]

❁ یونس صدفی رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ کے ہم عصر تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مسئلے میں میرا امام شافعی رحمہ اللہ سے اختلاف ہوگیا۔ میں وہاں سے چلا آیا اور کافی دیر کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ کیا کسی مسئلے میں ہماری رائے کا مختلف ہونا ہمارے بھائی چارے میں رکاوٹ بن سکتا ہے؟ تو

[1] الروح: 235/1. [2] الصمت وحفظ اللسان، ص: 137.

میں ان کے اس حسنِ اخلاق پر دنگ رہ گیا۔[1]

❁ امام احمد بن حنبل کے متعلق مذکور ہے کہ جب انھیں کسی مسئلے میں اشکال ہوتا تو وہ امام شافعی رحمہ اللہ سے راہنمائی لے لیا کرتے تھے اور لوگوں میں بھی امام شافعی رحمہ اللہ کے فضائل و مناقب اور ان کے اعلیٰ علمی مقام و مرتبے کا تذکرہ کیا کرتے اور فرماتے کہ اہل علم سے حسد کرنا انتہائی بری خصلت ہے۔[2]

❁ سلمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام فرّاء رحمہ اللہ امام کسائی رحمہ اللہ سے علم و عمر میں بڑے ہونے کے باوجود بھی ان کی تعظیم و تکریم کیا کرتے تھے۔

❁ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا اپنے ہم عصر شیوخ سے اکثر مباحثہ و مناظرہ ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی مسئلہ میں آپ کے مخالف رائے رکھنے والے ایک شیخ فوت ہو گئے تو ایک آدمی نے آپ کو آکر خوشی کے طور پر بتلایا کہ فلاں صاحب جو آپ سے اختلاف کیا کرتے تھے، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ آپ نے اس کو ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ کیا تو مجھے ایک صاحبِ علم مسلمان کی موت کی خبر دے کر خوش ہوتا ہے؟ حالانکہ تیرا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی ناراضی مول لینے کے مترادف ہے، پھر آپ مرحوم کے گھر تشریف لے گئے اور ان کے اہلِ خانہ سے تعزیت کی۔

❁ امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محمد بن سلام اور ابو حفص الفقیہ رحمہما اللہ کے آپس میں اختلافِ مؤقف کے باوجود محبت و اخوت برقرار رہتی تھی۔[3]

❁ سفیان بن عیینہ اور امام ابن وہب رحمہما اللہ دونوں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے آکر ابن عیینہ رحمہ اللہ سے مسئلہ پوچھا تو انھوں نے اس شخص کو ابن وہب رحمہ اللہ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ اہلِ مصر کے شیخ ہیں، ان سے

---

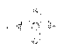
[1] سیر أعلام النبلاء: 16/10. [2] سیر أعلام النبلاء: 86/10. [3] سیر أعلام النبلاء: 630/10.

پوچھو۔[1]

❁ امام اخفش رحمہ اللہ نحو کے بلند پایہ امام تھے۔ وہ بڑھاپے کے باوجود امام سیبویہ رحمہ اللہ سے طویل مدت تک علمِ نحو میں استفادہ کرتے رہے اور قطعاً اسے معیوب نہیں سمجھا۔

❁ طلحہ رحمہ اللہ کے متعلق تمام لوگوں کی یہ رائے تھی کہ ان سے بڑھ کر علمِ قراءت کسی کے پاس نہیں ہے اور یہ بات بہت مشہور ہو گئی لیکن آپ کو بہت ناگوار گزری، چنانچہ آپ امام اعمش رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ضرورت نہ ہونے کے باوجود ان سے علم قراءت سیکھا تاکہ ان کی بابت لوگوں کا یہ تأثر ختم ہو سکے کہ صرف یہی قراءت کے امام ہیں۔[2]

❁ امام سفیان رحمہ اللہ کو کسی شخص نے کہا کہ امام مالک رحمہ اللہ دو آدمیوں کے امام بننے والے مسئلے میں آپ کی مخالفت کرتے ہیں تو امام سفیان رحمہ اللہ اس سے فرمانے لگے کہ میں کون ہوتا ہوں کہ تم مجھے امام مالک رحمہ اللہ پر قیاس کرو؟ امام مالک رحمہ اللہ تو عظمت وشان کے پیکر ہیں جبکہ میں ان کے مقابلے میں ہیچ ہوں۔[3]



[1] سیر أعلام النبلاء 63/39. [2] التهذيب: 26/5. [3] سیر أعلام النبلاء: 73/8.



طالب علم کا مسجد سے تعلق

مسجد سے تعلق استوار رکھنا

ایسے مسلمان بالعموم اور ایسے طلبہ بالخصوص قابل داد وتحسین ٹھہرتے ہیں جن میں باجماعت نماز ادا کرنے میں سبقت کا ذوق وشوق اور صفِ اول اور تکبیرِ اُولیٰ کے حصول کا حد درجہ حرص و لالچ پایا جاتا ہو۔ چونکہ طلبہ دوسروں کے لیے آئیڈیل ہوتے ہیں اور لوگ ان کے اقوال و افعال کی پیروی کرتے ہیں، اس لیے ان میں نماز کی پابندی کی فکر اور جذبے کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔

عموماً طلبہ میں عشاء اور فجر کی نماز میں سستی اور کاہلی پائی جاتی ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل عامۃ الناس کو تعلیم و تعلّم سے بدظن اور بے رغبت کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے، بلکہ بہت دفعہ ایسا بھی دیکھنے کو ملا ہے کہ علماء اور طلبہ کے قول و فعل میں تضاد عوام کو دین سے دور کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اذان سنتے ہی دیگر تمام تر کاموں کو خیر باد کہہ کر مسجد کی طرف چل پڑے کیونکہ دین کا علم مسجد سے تعلق استوار رکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔

اسلاف کا مسجد سے تعلق

اس سلسلے میں اسلاف کرام رحمہم اللہ کی عادات و صفات ہمارے لیے بہترین

نمونہ ہیں۔

- وکیع بن جراح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام اعمش رحمہ اللہ کی عمر ستر سال کے قریب ہوگئی تھی لیکن اتنی عمر میں بھی کبھی ان کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوتی تھی۔ [1]
- قاضی تقی الدین سلیمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی بھی فرض نماز اکیلے نہیں پڑھی، سوائے دو مرتبہ کے۔ [2]
- امام محمد بن سماعہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں عرصہ چالیس سال سے کبھی بھی تکبیر اولیٰ سے پیچھے نہیں رہا، سوائے ایک نماز کے، اس دن میری والدہ فوت ہوئی تھیں۔ [3]
- ابراہیم بن میمون رحمہ اللہ لوہے کا کام کرتے تھے، جب اذان کی آواز کانوں میں پڑ جاتی اور ہتھوڑا اوپر اٹھایا ہوتا تو اس کی ضرب بھی نہیں لگاتے تھے بلکہ اسے وہیں چھوڑ دیتے اور نماز کے لیے چل پڑتے۔ [4]
- سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کے بارے میں مذکور ہے کہ چالیس سال تک ان کا یہ معمول رہا ہے کہ اذان ہونے سے پہلے ہی مسجد میں موجود ہوا کرتے تھے۔ [5]
- امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز کا وقت آنے سے پہلے ہی میں نماز کی ادائیگی کے لیے بے چین رہتا تھا۔ [6]

متانت وشرافت کا معیار

اسلاف کسی شخص کے قابلِ اعتماد ہونے اور اُس کی متانت وسنجیدگی پرکھنے کے

---

① سير أعلام النبلاء: 628/6. ② ذيل طبقات الحنابلة: 365/2. ③ تهذيب التهذيب: 204/9. ④ تهذيب التهذيب: 1731. ⑤ تهذيب التهذيب: 87/4. ⑥ سير أعلام النبلاء: 164/3.

لیے اس کی نمازوں کے اہتمام کو معیار بنایا کرتے تھے جیسا کہ:

- ابراہیم بن یزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تم کسی آدمی کو دیکھو کہ وہ تکبیر اولیٰ کے معاملے میں سستی کا شکار ہے تو اس سے دور رہو (کیونکہ وہ اللہ کی یاد سے غفلت برتتا ہے)۔[1]
- اسی طرح امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث کی دو سندیں ہیں اور دونوں میں ضعف ہے اور ضعف بھی یکساں ہے۔ وجہِ ضعف یہ ہے کہ دونوں سندوں کے راوی نماز کے معاملے میں سستی کرتے تھے، لہٰذا جو راوی نماز میں سستی کا شکار ہو تو اس سے حدیث نہیں لینی چاہیے۔[2]
- شعبہ بن حجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے یحیٰ بن عبید اللہ التیمی سے اس وجہ سے حدیث روایت کرنا چھوڑ دی کہ وہ نماز کی پابندی نہیں کیا کرتا تھا۔[3]

نمازیوں کو تعلیم اور وعظ ونصیحت

طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو نماز کا پابند بنائے اور ہر نماز میں صفِ اوّل اور تکبیرِ اولیٰ میں شریک ہو اور نمازیوں کو وعظ ونصیحت بھی کرتا رہے تا کہ اس کے علم سے دیگر افراد بھی فیض یاب ہوسکیں۔ اسے اپنے لیے دنیا وآخرت میں فلاح وکامرانی کے حصول کا ذریعہ سمجھنا چاہیے اور ایسے کام شوق ورغبت سے کرنے چاہئیں۔

حالات کے مطابق احکام ومسائل کی تبلیغ

معمول کے وعظ وتبلیغ کے ساتھ ساتھ دیگر مواقع پر بھی لوگوں کو احکام ومسائل

1 سیر أعلام النبلاء: 62:5. 2 سیر أعلام النبلاء: 317:10. 3 میزان الاعتدال: 395/4.

سے آگاہ کرتے رہنا چاہیے، مثلاً:

1. سورج اور چاند گرہن کے موقع پر نمازِ کسوف اور نمازِ خسوف کے مسائل اور طریقہ بتلایا جائے۔
2. خشک سالی کی کیفیت میں نمازِ استسقاء کے حوالے سے گفتگو کی جائے۔
3. ماہ رمضان کے قریب اور اس کے دوران احکام و فضائلِ صیام کے متعلق دروس دیے جائیں۔
4. حج کے مہینوں میں احکامِ مناسک وغیرہ کے بارے میں راہنمائی دی جائے۔
5. عیدین، نمازِ جنازہ اور نفلی نمازوں کے طریقے کی تعلیم دی جائے۔
6. روزمرہ مسائل کی تعلیم کے ساتھ ساتھ، فکرِ آخرت کی طرف توجہ دلانا سب سے اہم معاملہ ہے کیونکہ موت کے بعد کی زندگی کا یقین ہی معمولاتِ زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنے کا اہم ذریعہ ہے۔

مختصر تعلیم وتدریس کا سلسلہ

مسجد کی انتظامیہ اور دیگر افراد کے تعاون سے روزانہ یا ہفتہ وار مطالعۂ قرآن و حدیث کلاس کا اہتمام کیا جائے تاکہ معاشرے کے تمام افراد کے لیے اسلامی تعلیمات کا سیکھنا ممکن ہو سکے۔ اس کلاس میں عقیدۂ توحید، رسالت، آخرت، قرآن کا مقصد نزول، تلاوتِ قرآن اور اس کے آداب، تجوید، ترجمۂ قرآن و مطالعہ احادیث کے علاوہ روزمرہ مسائل کی تفہیم کا اہتمام ہو۔

اس سلسلے میں یہ بات مدنظر رہے کہ بچوں، بوڑھوں اور دیگر تمام افراد کو اس کلاس میں شرکت کی بھرپور دعوت دینی چاہیے اور اس کی اہمیت وضرورت اور اس

کے فضائل وثمرات بتلانے چاہئیں۔اس کام کا اجر وثواب بہت زیادہ ہے، جیسا کہ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ دَلَّ عَلٰى خَيْرٍ فَلَهُ أَجْرُ مِثْلِ فَاعِلِهِ»

''جو شخص کسی کی نیکی کے کام کی طرف راہنمائی کرتا ہے تو اس کے لیے بھی اس نیکی کرنے والے کے برابر اجر ہے۔''[1]

تو گویا جتنے بھی لوگ آپ کی ترغیب اور راہنمائی سے نیکی کے اس کام میں شریک ہوں گے وہ جب تک اس پر عمل پیرا رہیں گے تب تک ان تمام کے اجر و ثواب کے برابر آپ کو بھی ثواب ملتا رہے گا۔

ائمہ مساجد کے لیے ملحوظ اُمور

ائمہ مساجد کو لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق اور اچھے برتاؤ کے ساتھ پیش آنا چاہیے، ان کے ساتھ میل جول رکھنا اور ان کے احوال سے باخبر رہنا چاہیے، مریض کی عیادت اور فوت ہونے والے کی تعزیت کو اخلاقی فرض اور تمام معاملات میں خلوصِ نیت اور صدقِ دل سے لوگوں کی راہنمائی کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ امام مسجد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ذیل کے منفی رویوں سے اجتناب کریں:

- نمازیوں سے میل جول نہ رکھنا۔
- ان کی خیر و عافیت دریافت نہ کرنا۔
- ان کی دعوت قبول نہ کرنا۔
- گفتگو کرتے ہوئے بدخلقی کا مظاہرہ کرنا۔

[1] صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب فضل اعانة الغازى فى سبيل الله، حديث: 3509.

- کسی مسئلے میں شرعی راہنمائی دیتے ہوئے شدت اور درشتی کا مظاہرہ کرنا۔
- ہر معاملے میں من مانی کرنا، انتظامیہ یا نمازیوں سے مشاورت نہ کرنا۔

مذکورہ بالا تمام امور میں سے کوئی ایک معاملہ بھی لوگوں کے دلوں میں نفرت کا بیج بونے کے لیے کافی ہے لیکن خدانخواستہ اگر کسی امام مسجد میں یہ تمام خصائل جمع ہوجائیں تو لوگ اس کے وعظ و دروس کیسے سنیں گے؟ اور اگر وہ بادلِ نخواستہ سُن بھی لیتے ہوں تو اس بے عمل عالم کی بات کا کیا اثر قبول کرتے ہوں گے؟

نیز افراط وتفریط کا معاملہ اپنانے سے بھی گریز کرنا چاہیے، یعنی ایسا نہ ہو کہ اگر اس میں یہ خامیاں نہیں ہیں تو ان کے برعکس وہ دوسرے معاملات میں اس قدر آگے بڑھ جائے کہ اپنا وقار ہی کھو بیٹھے اور اپنی بے اعتدالی سے خوبیوں کو بھی خامیوں کی صورت دے دے، چنانچہ متذکرہ بالا امور سے احتراز کے ساتھ ساتھ ذیل کے کچھ امور سے بھی اجتناب ضروری ہے:

- ہر وقت لوگوں میں ہی گھلے ملے رہنا۔
- عام سطحی مجالس میں شرکت کرنا۔
- فضول گفتگو کرنا اور ہنسی مذاق کے جملے کسنا۔
- ایسی ایسی باتیں کر جانا جو مروت کے منافی اور پردۂ حیا کو چاک کر دینے والی ہوں۔
- لوگوں کی غیبت وچغلی کرنا اور ان سے بدگمانی کرتے رہنا۔
- اپنی امامت کو برقرار یا مفادات کے حصول کے لیے انتظامیہ کی چاپلوسی کرنا۔
- بااثر افراد سے تعلقات رکھنا، یا ان سے کسی قسم کی اُمید وخواہش رکھنا۔

جب کسی امام کی ایسی حالت ہوجائے تو پھر امامت جیسا عالی منصب فریضہ

اپنی تقدیس کھو دیتا ہے اور کھیل تماشہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں جب امام اپنے مقتدیوں کو وعظ ونصیحت کرے گا یا تعلیم دینا چاہے گا تو اس کی بات قطعاً اثر انداز نہ ہوگی اور لوگ بھی اس کی اپنی اخلاقی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے اس کی باتوں کو قبول نہیں کریں گے، اس لیے تمام معاملات میں اعتدال اور میانہ روی کو اپنانا چاہیے اور شرعی و اخلاقی ضوابط کو ملحوظ رکھ کر لوگوں کے ساتھ تمام معاملات نمٹانے چاہئیں۔

طالب علم اور اہل خانہ کی تربیت

طالب علم پر عائد فریضہ

طالب علم کو بارش کی مانند ہونا چاہیے کہ وہ جہاں بھی برستی ہے فائدہ ہی پہنچاتی ہے، لہٰذا طالب علم جب اپنے گھر میں ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے اہل وعیال کی تربیت اور دینی مسائل میں ان کی راہنمائی کرے۔

نبی مکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهِ»

''تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیرِ نگیں افراد کے متعلق سوال کیا جائے گا۔''[1]

طالب علم کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے گھر کے تمام افراد کو اسلام کے اساسی امور: ایمان، اسلام اور اخلاق کے متعلق تعلیم دے، اگرچہ وہ انھیں پہلے سے جانتے بھی ہوں تب بھی بغرض تذکیر یہ کام وقتاً فوقتاً کرتے رہنا چاہیے، مثلاً: وضوء، غسل، تیمّم اور نماز کا مسنون طریقہ سکھلایا جائے، اسی طرح روزہ، زکاۃ و حج کے متعلقہ تمام احکام کی تعلیم دے، عبادات کے بعد اخلاقیات اور حسن معاشرت کے آداب اور معاملاتِ زندگی میں ملحوظ رکھنے والے اصول وضوابط کے بارے بھی

[1] صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب فضيلة الامام العادل، حديث: 3408.

احسن انداز سے ان کی تربیت کرے۔[1]

بچوں کی تربیت پر خصوصی توجہ

بچوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دینی چاہیے تاکہ بچپن سے ہی وہ ان عادات و خصائل کو اپنا سکیں جو اُن کے عمل و کردار میں نکھار پیدا کر سکیں۔ بچے ہمیشہ وہی کچھ سیکھتے ہیں جو وہ گھر کے ماحول میں دن رات دیکھتے ہیں، اس لیے ان کے لیے گھر میں ایک مکمل اسلامی ماحول فراہم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھیں نماز و قرآن، مسنون دعاؤں اور اذکار کی تعلیم دی جائے۔ پہلے خود فرائض و سنن کا اہتمام کرنا چاہیے اور پھر انھیں محبت و شفقت سے ترغیب دلانی چاہیے تاکہ قول و عمل دونوں طرح سے ان کی مؤثر تربیت ہو سکے اور بچپن میں ہی ان کے ذہنوں میں اسلامی تہذیب و ثقافت راسخ ہو جائے، جس پر انھیں فخر بھی ہو اور اس تہذیب پر جینا اور مرنا اُن کا اوڑھنا بچھونا بھی بن جائے۔

نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«عَلِّمُوا الصَّبِيَّ الصَّلَاةَ ابْنَ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُ عَلَيْهَا ابْنَ عَشْرٍ»

''جب بچہ سات برس کا ہو جائے تو اسے نماز کی تعلیم دو اور جب دس برس کو پہنچ جائے تو اس سے سختی سے نماز کی پابندی کراؤ۔''[2]

یعنی سات برس کی عمر میں انھیں فرائض کی تعلیم و ترغیب دینی چاہیے تاکہ وہ اس کے پابند ہو جائیں لیکن اگر وہ دس برس کی عمر کو پہنچ کر بھی ان کی ادائیگی میں

---

[1] المدخل لابن الحاج: 209/1. [2] السنن الكبرى للبيهقي: 83/3.

سستی کریں تو سخت تادیبی سرزنش کے ذریعے ان سے پابندی کروانا ضروری ہے۔

نبی کریم ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں، آپ ﷺ نے تمام انسانوں کے حقوق کی ادائیگی پر زور دیا ہے، بچوں کے متعلق ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا»

''جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''[1]

لیکن بچوں کو نماز کا پابند بنانے کے لیے آپ ﷺ کا درج بالا فرمان نہایت قابل غور ہے کہ بچہ جب سات برس کا ہو جائے تو اسے نماز کی تعلیم دو اور جب دس برس کا ہو جائے تو اس سے سختی سے نماز کی پابندی کراؤ۔

مطلب یہ کہ دس برس کی عمر تک مسلمان بچوں کو نماز کے مسائل اور طریقے سیکھ جانا اور انھیں نماز کا پابند بن جانا چاہیے۔ اس فرمانِ نبوی سے اسلام میں نماز کی اہمیت کا خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے، یعنی خود کو مسلمان کہلوانے والا فرد بے نماز نہیں ہو سکتا، خواہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا کوئی دین نہیں ہے جو نماز نہ پڑھے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک شخص سے فرمایا کہ اپنی اولاد کو دین اسلام کے فرائض و واجبات کی تعلیم دو، اس لیے کہ تم سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے اپنی اولاد کی کیسی تربیت کی؟ اور تمھاری اولاد بھی روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جواب دہ ہوگی کہ انھوں نے اپنے والدین سے کیسا سلوک کیا؟[3]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے صدقے کی ایک

---

[1] صحيح مسلم، باب اذا أحب الله عبدًا، حديث:4772، الترمذي، باب ما جاء في رحمة الصبيان، حديث:1842. [2] مسند البزار:61/3. [3] كتاب الفقيه والمتفقه:49/1.

کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی تو نبی ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: اسے منہ سے نکال پھینکو، کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آل محمد (ﷺ) صدقہ نہیں کھاتے۔"[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ بچوں کو ان کے لیے نفع بخش امور اپنانے کی ترغیب اور نقصان دہ کاموں سے باز رہنے کی تعلیم دیتے رہنا چاہیے۔[2]

امام ماوردی رحمہ اللہ کا قول ہے:

بَادِرُوْا بِتَأْدِيْبِ الْأَطْفَالِ قَبْلَ الْإِشْتِغَالِ.

"بچوں کی تربیت ان کے دیگر کاموں میں مشغول ہونے سے پہلے ہی کردینی چاہیے۔"

ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

كَانُوْا يَضْرِبُوْنَنَا عَلَى الشَّهَادَةِ وَالْعَهْدِ وَنَحْنُ صِغَارٌ.

"ہمیں بچپن میں (جھوٹی) قسم اٹھانے اور وعدے (کی خلاف ورزی کرنے) پر مار پڑتی تھی۔"

اسی ضمن میں ایک شاعر نے کہا:

إِنَّ الْغُصُوْنَ إِذَا قَوَّمْتَهَا اعْتَدَلَتْ ۔۔۔ وَلَا يَلِيْنُ إِذَا قَوَّمْتَهُ الْخَشَبُ

قَدْ يَنْفَعُ الْأَدَبُ الْأَحْدَاثُ فِيْ صِغَرٍ ۔۔۔ وَلَيْسَ يَنْفَعُ عِنْدَ الشَّيْبَةِ الْأَدَبُ

"ٹہنیوں کو جب تم شروع سے سیدھا رکھو گے تو وہ سیدھی رہیں گی جبکہ

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب ما يذكر في الصدقة للنبي ﷺ، حديث: 1491، صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب تحريم الزكاة على رسول الله ﷺ وعلى آله، حديث: 1069. [2] فتح الباري: 414/2.

بعد میں لکڑی کے سہارے سے بھی سیدھی نہیں ہو پائیں گی اور ادب بھی کم سنی میں ہی سکھایا جائے تو فائدہ مند ہوتا ہے، بڑھاپے میں ادب سیکھنا چنداں فائدہ نہیں دیتا۔"

گھر والوں کو دینی تعلیم دینا

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ: رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ ﷺ وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ إِذَا أَدّٰى حَقَّ اللّٰهِ وَ حَقَّ مَوَالِيْهِ وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ أَمَةٌ فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيْبَهَا وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ أَجْرَانِ»

"تین آدمیوں کے لیے دوگنا اجر ہے: ایک اہل کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے نبی علیہ السلام پر بھی ایمان لایا اور پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لایا۔ دوسرا وہ جو غلام ہو اور اس کے باوجود بھی اپنے مالک کا اور اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرے اور تیسرا وہ شخص جس کے پاس لونڈی ہو، وہ اچھے طریقے سے اس کی تعلیم و تربیت کرے اور پھر اسے آزاد کر کے اس سے شادی کرلے تو اس کے لیے بھی دوگنا اجر ہے۔"[1]

مذکورہ حدیث سے یہ بات احاطۂ علم میں آتی ہے کہ جب اپنی لونڈی کی تعلیم و تربیت پر اللہ تعالیٰ دوہرے اجر سے نوازتا ہے تو پھر خود اپنے بیوی بچوں اور گھر والوں کی تعلیم وتربیت پر تو اس سے بھی بڑھ کر اجر وثواب ہوگا۔

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح :1/229، حدیث:97.

سیدنا مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (بغرض حصول علم) گئے اور وہاں بیس دن قیام کیا۔ آپ انتہائی شفیق و مہربان تھے۔ جب آپؐ نے یہ محسوس کیا کہ ہم گھروں کو لوٹنا چاہتے ہیں تو فرمایا:

«اِرْجِعُوْا فَکُوْنُوْا فِیْهِمْ وَعَلِّمُوْهُمْ»

''واپس چلے جاؤ اور جن لوگوں میں رہو انھیں بھی تعلیم دو۔''[1]

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں اہل و عیال کو تعلیم دینے کا حکم فرمایا ہے۔ اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾

''اے ایمان والو! خود کو اور اپنے گھر والوں کو (جہنم کی) آگ سے بچاؤ۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

عَلِّمُوْا أَهْلِیْكُمُ الْخَیْرَ.

''اپنے گھر والوں کو خیر و بھلائی کی باتیں سکھلاؤ۔''[3]

گھر کا ماحول اسلامی بنانا

گھر والوں کی قولی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ عملی نمونہ بھی پیش کرنا چاہیے تاکہ گھر کا ماحول اسلامی رنگ میں ڈھل سکے اور گھر کے تمام افراد آپ کے حسنِ عمل سے اکتساب کر سکیں۔ اسی وجہ سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَفْضَلُ صَلَاتِكُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ إِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ»

---

[1] صحیح البخاري، کتاب العلم، باب: 25، قبل الحدیث: 87. [2] التحریم 66:6.
[3] الترغیب والترهیب: 76/1.

''فرض نماز کے علاوہ افضل نماز وہی ہے جو گھر میں ادا کی جائے۔''[1]

تاکہ آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر گھر والوں میں بھی اس کا شوق پیدا ہو سکے۔

نبی ﷺ بھی نفلی نماز اکثر گھر میں ہی ادا فرمایا کرتے تھے۔[2]

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کی بابت ذکر ہے کہ وہ اتباعِ سنت میں نوافل گھر ہی ادا کیا کرتے تھے۔

ان تمام اقوال و آثار کے ذکر کا مقصد صرف یہ ہے کہ جب خود کو نمونہ بنا کر پیش کیا جائے اور گھر میں عبادات و اخلاقی تعلیم کا اہتمام کیا جائے تو گھر کا ماحول از خود اسلامی بن جاتا ہے جس کا اہل و عیال کی تربیت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

بڑوں کی عادات کا بچوں پر اثر

اکثر بچے بڑوں کی تمام عادات کو اپنانے اور خود کو انھی جیسا بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے بڑوں کی اچھی عادات کا بچوں پر اچھا اثر اور بُری عادات کا برا اثر پڑتا ہے۔

لہٰذا اچھی عادات و خصائل اپنا کر خود کو بچوں کے لیے نمونہ بنانا چاہیے تاکہ جب وہ آپ کی عادات کو اپنائیں تو اچھی عادات ہی اپنائیں۔ اس کے برعکس نہیں ہونا چاہیے کہ آپ بری عادات میں مبتلا ہوں جس کی وجہ سے بچوں میں بھی وہی عادات منتقل ہو جائیں جو اُن کے جوان ہونے پر آپ کے لیے پریشانی کا باعث اور ان میں پستی کردار کا سبب بنیں۔

[1] جامع الترمذي، ابواب الصلاة، باب ماجاء في صلاة التطوع، حديث: 412. [2] مختصر قيام الليل للمَرْوَزي، ص: 63، الروضة الندية: 112/1. [3] ذيل طبقات الحنابلة: 134/2. [4] ذيل طبقات الحنابلة: 134/2.

طالب علم اور شب بیداری

شب بیدار لوگوں کی قسمیں

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا سَمَرَ إِلَّا لِمُصَلٍّ أَوْ مُسَافِرٍ»

"رات کو باتیں کرنا نمازی اور مسافر کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔"[1]

اس سے مراد عشاء کی نماز کے بعد کا وقت ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بعد از عشاء کلام کرنے والوں کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں:

- ایک وہ شخص جس کا باتیں کرنا اس کے لیے سود مند ہو۔
- دوسرا وہ جس کا باتیں کرنا اس کے لیے نقصان دہ ہو۔
- تیسرا وہ شخص جو اِن دونوں میں سے نہ ہو۔

سود مند ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ عشاء کی نماز کے بعد قرآن کی قراءت، اذکار و نوافل یا تعلیم و تعلّم کی وجہ سے اپنے رب سے، اساتذہ سے یا اپنے ساتھیوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ یہ عمل مستحسن اور باعث اجر وثواب ہے۔

نقصان دہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ عشاء کے بعد گناہوں اور برے

---

[1] مسند أحمد: 379/1، و السلسلة الصحيحة: 434/5، حديث: 2435.

کاموں کا ارتکاب کرے، یہ مذموم اور باعث سزا عمل ہے۔

تیسری قسم میں وہ شخص آتا ہے جو نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد سو جاتا ہے۔[1]

شب بیداری کی مکروہ صورتیں

رات کو جاگنے کے معاملے میں، اُس کی ضرورت کو مدنظر رکھنا ہوگا کیونکہ بلاضرورت جاگنے میں تو کئی قسم کی قباحتیں ہیں، مثلاً:

1. جب رات کو فضول باتیں یا بے فائدہ کام کیے جائیں تو سوائے گناہ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔
2. زیادہ دیر تک جاگتے رہنے سے نمازِ فجر کے ضائع ہونے، یا اس میں تاخیر ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔
3. رمضان المبارک میں سحری اور نوافل و وتر کی ادائیگی دشوار ہو جاتی ہے۔

ان امور کے پیش نظر بعد از عشاء جاگنے یا بے فائدہ کام کرنے کو نبی ﷺ نے مکروہ قرار دیا ہے۔

شب بیداری کی ممدوح صورتیں

تعلیم و تعلّم اور عبادت کے لیے بیدار رہنا یا گفتگو کرنا مستحب عمل ہے کیونکہ یہ ایسا عمل ہے جس پر ثواب حاصل ہوتا ہے لیکن یہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ صرف مقصد کو ہی ملحوظ رکھا جائے اور اس کا بھی اہتمام کیا جائے کہ نمازِ فجر ضائع نہ ہونے پائے۔

نوافل پر واجبات کو مقدم رکھا جائے

نوافل کے اہتمام میں واجبات کو ترک کر دینا ثواب کے بجائے باعثِ سزا

---

[1] مختصر قیام اللیل للمروزی، ص: 12.

بن سکتا ہے۔ جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سلیمان بن ابی حثمہ کو نمازِ فجر میں غائب پایا تو ان کے گھر جا کر ان کی ماں سے پوچھا کہ آج نماز فجر میں سلیمان شریک کیوں نہیں ہوئے؟ امّ سلیمان نے جواب دیا کہ وہ قیام اللیل میں مشغول رہنے کی وجہ سے دیر سے سویا اور غلبۂ نیند کے باعث نمازِ فجر میں حاضر نہیں ہو سکا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«لَأَنْ أَشْهَدَ صَلَاةَ الصُّبْحِ فِي الْجَمَاعَةِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَقُوْمَ لَيْلَةً»

''باجماعت نماز ادا کرنا میرے نزدیک ساری رات قیام میں گزار دینے سے بہتر ہے۔''[1]

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نوافل کے اہتمام کی وجہ سے واجبات ترک ہونے کو معیوب سمجھا ہے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ شب بیداری میں یہ شرط عائد کرتے تھے کہ اگر اس سے صبح کی نماز ضائع نہ ہو تو پھر کوئی حرج نہیں، ورنہ یہ مکروہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہمارے لیے بہترین اسوہ ہے۔[2]

علم وعبادت کے لیے شب بیداری کی ترغیب

امام ابن حِبّان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عشاء کے بعد گفتگو کرنا یا جاگنا صرف ان معاملات میں مکروہ جانا گیا ہے جو تعلیم و تعلّم اور عبادت کے علاوہ ہوں۔ ایک مرتبہ اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ اور انصار کا ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے گفتگو کرتے رہے،

[1] المؤطا، كتاب الصلاة، ص: 101. [2] الاعتصام، ص: 25.

یہاں تک کہ رات کا ایک حصہ بیت گیا۔ دونوں کے پاس ایک ایک چھڑی تھی۔ جب وہ واپس جانے لگے تو (کرشمۂ قدرت سے) اُن میں سے ایک کی چھڑی روشن ہوگئی اور وہ اس کی روشنی میں راستہ دیکھتے ہوئے چلتے رہے، جب ان کے راستے جدا ہونے لگے تو دوسرے کی چھڑی بھی روشن ہوگئی اور وہ اپنی اپنی چھڑی کی روشنی میں راستہ دیکھتے ہوئے بآسانی گھر پہنچ گئے۔[1]

یہ حدیث بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ سے دونوں آدمیوں کی گفتگو احکام و مسائل کا علم حاصل کرنے کے متعلق ہوگی تبھی تو آپ ﷺ بھی رات گئے تک ان کے ساتھ تشریف فرما رہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی چھڑیوں کو روشن فرما کر اندھیری رات میں ان کے راستے میں روشنی کا اہتمام فرما دیا۔

اسی ضمن میں ابن حبان رحمہ اللہ دوسری حدیث نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر بعد از عشاء تعلیم و تعلّم وعبادت کے لیے جاگنا یا گفتگو کرنا مکروہ ہوتا تو نبی کریم ﷺ نہ تو خود ایسا فرماتے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ترغیب دیتے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک رات ہم نبی ﷺ کا انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ آدھی رات گزر گئی، پھر آپ ﷺ تشریف لائے، ہمیں نماز پڑھائی اور فرمایا:

«إِنَّ النَّاسَ قَدْ صَلُّوْا وَرَقَدُوْا وَإِنَّكُمْ لَنْ تَزَالُوْا فِيْ صَلَاةٍ مُنْذُ انْتَظَرْتُمُ الصَّلَاةَ»

”لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے اور سو گئے ہیں، بلاشبہ تم اس وقت نماز کی

[1] صحيح ابن حبان: 3/367.

کیفیت میں ہی شمار ہو گے جب تک تم نماز کا انتظار کرتے رہو گے۔''[1]

قیام اللیل کی فضیلت واہمیت

اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو فرض نمازوں کے علاوہ نوافل کی صورت میں نمازِ تہجد کے اہتمام کا حکم فرمایا:

﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾

''اور رات (کی عبادات) میں تہجد کا اہتمام کیجیے، یہ آپ کے لیے نفلی عبادت ہوگی۔ (اسی وجہ سے) عنقریب آپ کا پروردگار آپ کو مقامِ محمود پر فائز کرے گا۔''[2]

فرض نمازوں کے بعد سب سے زیادہ فضیلت کی حامل عبادت قیام اللیل ہے، جیسا کہ نبی مکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«أَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْمَكْتُوبَةِ الصَّلَاةُ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ»

''فرض نماز کے بعد افضل نماز رات کے درمیانی حصے میں پڑھی جانے والی نماز ہے۔''[3]

قیام اللیل کے اہتمام کا حکم قرآن وسنت سے ثابت ہے، اس لیے تمام مسلمانوں کو بالعموم اور طلبہ کو بالخصوص اس کا اہتمام کرنا چاہیے بلکہ ہر طالب علم کو چاہیے کہ وہ قیام اللیل کو اپنے اوپر لازم کر لے تا کہ علم کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ

[1] صحيح البخاري، كتاب الأذان، باب يستقبل الإمام الناس إذا سلّم، حديث: 847. [2] الاسراء 79:17. [3] صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب فضل صوم المحرم، حديث: 1983.

سے بھی تعلق مضبوط رہے۔

قیام اللیل کے خصائص وفوائد

قیام اللیل سے بندگی کرنے کا ولولہ اور انعاماتِ الٰہی پر شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی فوائد حاصل ہوتے ہیں، مثلاً:

- اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔
- یہ گناہوں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔
- یہ برائیوں کا کفارہ بھی ہے۔

قیام اللیل (تہجد) کے یہ فوائد نبی مکرم ﷺ کے اس فرمان سے ثابت ہیں:

«عَلَيْكُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ فَإِنَّهُ قُرْبَةٌ إِلَى اللّٰهِ تَعَالىٰ وَمَنْهَاةٌ عَنِ الْإِثْمِ وَتَكْفِيرٌ لِلسَّيِّئَاتِ»

"قیام اللیل کی پابندی کرو کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور یہ گناہوں سے بچنے کا ذریعہ اور برائیوں کا کفّارہ ہے۔" [1]

- قیام اللیل دخولِ جنت کا باعث ہے جیسا کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا:

«صَلُّوْا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوْا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ»

"جب رات کو لوگ سو رہے ہوں تو اس وقت نماز پڑھا کرو، تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو گے۔" [2]

- مومن کی عزت وشرف کی علامت ہے، جیسا کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

---

[1] مسند أحمد: 2379، وصحيح الجامع، حديث: 4079. [2] جامع الترمذي، أبواب الدعوات، باب ماجاء في فضل إطعام الطعام، حديث: 2485.

«شَرَفُ الْمُؤْمِنِ قِيَامُهُ بِاللَّيْلِ»

''مومن کا شرف اس کے قیام اللیل کے اہتمام میں ہے۔''[1]

6 یہ بلندیٔ درجات کا ذریعہ ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درجات کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِطْعَامُ الطَّعَامِ وَلِيْنُ الْكَلَامِ وَالصَّلَاةُ بِاللَّيْلِ»

''کھانا کھلانا، شائستہ انداز میں گفتگو کرنا اور رات کو نماز ادا کرنا۔'' (یہ امور بلندیٔ درجات کا باعث ہیں)۔[2]

7 یہ خیر و بھلائی کے حصول کا طریقہ ہے۔

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«أَلَا أَدُلُّكَ عَلٰى أَبْوَابِ الْخَيْرِ: الصَّوْمُ جُنَّةٌ وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ وَصَلَاةُ الرَّجُلِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ»

''کیا میں تمھیں خیر و بھلائی کے ابواب کے متعلق نہ بتلاؤں؟ (وہ یہ ہیں:) روزہ (گناہوں سے بچنے کے لیے) ڈھال ہے، صدقہ خطاؤں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جیسے پانی آگ کو ختم کر دیتا ہے اور رات کے درمیانی وقت میں نماز پڑھنا۔''[3]

---

[1] السلسلة الصحيحة: 330/2، حديث: 831. [2] مسند أحمد: 243/5، حديث: 2109. [3] جامع الترمذي، ابواب الإيمان، باب ماجاء في حرمة الصلاة، حديث: 2541.

سونے اور جاگنے میں اسوۂ رسول ﷺ

قیام اللیل کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا اسوہ اپنانا چاہیے۔ آپ رات کو عبادت بھی فرمایا کرتے تھے اور آرام بھی تاکہ جسم کا بھی حق ادا ہو سکے۔ نیند اور بیداری میں آپ ﷺ متوازن طریقہ اختیار فرمایا کرتے تھے۔ نہ تو آپ ﷺ نیند کا غلبہ ہونے دیتے اور نہ ہی ساری ساری رات قیام میں گزار دیتے بلکہ دونوں کاموں کے لیے ایک موزوں اور مناسب معمول اپناتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جب نبی ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھنا چاہتے تو نماز پڑھتے ہوئے پاتے اور جب سوئے ہوئے دیکھنا چاہتے تو آپ ﷺ کو سوئے ہوئے پاتے۔[1]

یعنی آپ ﷺ کی عبادت توازن اور اعتدال پر مبنی ہوتی تھی، پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو شب بیداری میں طریقۂ عبادت کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

«أَحَبُّ الصَّلَاةِ إِلَى اللّٰهِ صَلَاةُ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَنَامُ نِصْفَ اللَّيْلِ وَيَقُوْمُ ثُلُثَهُ وَيَنَامُ سُدُسَهُ»

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نماز داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ آپ آدھی رات تک نیند فرماتے، پھر تہائی رات قیام کرتے اور پھر رات کا چھٹا حصہ سو جاتے۔''[2]

پھر اس بات کا بھی بالخصوص خیال رہنا چاہیے کہ نیند اتنی غالب نہ آجائے کہ صبح کی اذان ہی کانوں میں نہ پڑے۔ نبی مکرم ﷺ جب کسی جگہ

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب قيام النبي ﷺ بالليل من نومه، حديث: 1141.

[2] صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب من نام عند السحر، حديث: 1131.

رات کو پڑاؤ ڈالتے تو اپنے داہنے ہاتھ کو تکیہ بنا لیتے اور فجر کے قریب نیند فرماتے تو اپنی ہتھیلی کو سر کے نیچے رکھ کر کلائی کو کھڑا کر لیتے تھے۔"[1]

مناوی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ دائیں ہاتھ کو تکیہ اُس وقت بناتے تھے جب رات کا زیادہ حصہ باقی ہوتا تو آپ سکون سے سو جاتے تھے اور جب رات کا تھوڑا حصہ باقی ہوتا اور فجر کا وقت قریب ہوتا تو اس وقت کلائی کو کھڑا کر کے سو جاتے تا کہ بے سکونی کے باعث گہری نیند نہ سو سکیں۔[2]

طالب علم کو ہر حالت میں آئیڈیل ہونا چاہیے

طالب علم کو یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اسے اپنے ہر عمل میں لوگوں کے لیے آئیڈیل بننا ہے، اس لیے ان تمام اعمال کی پابندی کرنی چاہیے جو اپنی ذات اور دیگر افراد کے لیے نفع بخش ہوں اور نقصان دہ امور سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ وہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہو گا جنھوں نے آپ کو اپنا آئیڈیل بنانا ہو گا، اس لیے طالب علم کو اسوۂ رسول ﷺ اپنانا چاہیے اور اسلاف کرام رحمہم اللہ کی عادات وصفات سے استفادہ کرنا چاہیے تا کہ اس کے نیک عمل کو دیکھ کر اگر کوئی اسے اختیار کرتا ہے تو وہ اس کے لیے باعث اجر ہونے کے ساتھ ساتھ طالب علم اور اسلاف کے لیے تا قیامت صدقۂ جاریہ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود کو بدعات وخرافات اور خلافِ شرع امور کے ارتکاب سے بھی باز رکھنا چاہیے کیونکہ اگر کوئی آپ میں وہ پست اخلاق واعمال دیکھ کر اسے اپنا لے گا تو یہ تا قیامت باعثِ گناہ وسزا بنا رہے گا۔

---

[1] مسند أحمد: 298/5، صحيح ابن خزيمة: 2558، صحيح الجامع: 4752. [2] فيض القدير 149/5.

ہر طالب علم پر لازم ہے کہ وہ خود کو ایسے رنگ میں رنگے کہ اس کے ہر قول و عمل سے لوگ فائدہ ہی حاصل کریں۔ اس کی کوئی بات، عادت اور کام ایسا نہ ہو جو لوگوں کے لیے باعثِ ضرر ہو مگر اس میں بھی یہ شرط ملحوظ رہے کہ اس کا ہر قول و عمل قرآن و سنت کی تعلیمات کے موافق ہو۔

عاداتِ اَسلاف کو پیشِ نظر رکھے

طالب علم کو اسلاف کے حالات و عادات کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ وہ حصولِ علم کے کس قدر حریص ہوا کرتے تھے اور اپنے تمام تر امور اور آرام و سکون پر تعلیم و تعلّم کو ترجیح دیا کرتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے اپنے روز و شب وقف کر رکھے تھے۔ فضیل بن غزوان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں ابن شبرمہ، مغیرہ اور حارث العلکی رحمہم اللہ رات کو مجلس کرتے اور فقہی مسائل پر بحث کیا کرتے تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کسی مسئلے پر بحث کرتے کرتے ساری رات بیت جاتی اور بوقتِ فجر مجلس اختتام پذیر ہوتی۔[1]

شب بیداری کی عادت اپنانی چاہیے

طالب علم کو ساری رات نیند میں ہی نہیں گزار دینی چاہیے بلکہ رات کا کچھ حصہ تعلیم و تعلّم اور عبادات کے لیے بھی وقف کرنا چاہیے اور دورانِ تعلیم ہی خود کو اس عادتِ حسنہ کا عادی بنانا چاہیے۔

سلیمان التیمی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّ الْعَيْنَ إِذَا عَوَّدْتَّهَا النَّوْمَ اِعْتَادَتْ وَإِذَا عَوَّدْتَّهَا

---

[1] السیر 348/6.

السَّهَرَ اِعْتَادَتْ.

''آنکھ کو نیند کا عادی بنایا جائے تو وہ اس کی عادی بن جاتی ہے اور اگر اسے شب بیداری کی عادت ڈالی جائے تو اس کی بھی عادت پڑ سکتی ہے۔''[1]



[1] مختصر قیام اللیل للمروزی، ص: 55.

طالب علم کا اپنے ساتھیوں سے تعلق

احباب و رفقاء سے حسن سلوک

طالب علم اور اساتذہ شب و روز تعلیم و تعلّم میں مگن رہتے ہیں۔ معلم سرمایۂ علم کو اپنے شاگردوں میں منتقل کرنے میں مصروف رہتا ہے اور متعلم، علم کی دولت کو اکٹھا کرنے کے لیے شب و روز تگ و دو کرتا ہے۔ غرض دونوں اسی مقصد کے لیے محنت کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عملِ تعلیم میں وہ لوگ جن کی صحبت و معیت حاصل ہوتی ہے وہ طالب علم کے ہم مکتب و ہم سفر احباب و رفقاء ہوتے ہیں اور انھی کے ساتھ اس کے روز و شب بسر ہوتے ہیں۔ طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شیوخ و اساتذہ کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھے اور ہم مکتب رفقاء کے ساتھ بھی حسن اخلاق اور پیار و محبت سے پیش آئے۔ خوش خلقی کے ساتھ ان سے ہر معاملہ نمٹائے اور احسن انداز سے ان کے ساتھ میل جول قائم رکھے۔ اگر خود کسی سبق میں کمزور ہو تو دیگر ساتھیوں سے اس معاملے میں راہ نمائی لینے میں عار محسوس نہ کرے۔ خواہ وہ اس سے چھوٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر نصابی سرگرمیوں میں کوئی طالب علم تعاون اور راہ نمائی کا محتاج و طلب گار ہو تو اس سے اجتناب نہیں، بلکہ تعاون کا رویہ اپنانا چاہیے۔ اس سے آپس کی محبت بھی بڑھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی بھی حاصل ہوتی ہے۔

چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کا ادب

طالب علم کو یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اگر کوئی اس سے علم میں کم تر ہے تو اس سے حقارت ونفرت سے پیش نہ آئے اور اس پر اپنی بڑائی نہ جتائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کے ایسے تکلیف دہ رویے سے احساسِ کمتری کا شکار ہو جائے، بلکہ اس کے ساتھ شفقت و رحم اور بڑے بھائیوں کا سا انداز اپنانا چاہیے تاکہ وہ آپ کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر آپ کا ادب و احترام کرے اور حوصلہ افزائی سے پڑھائی پر زیادہ سے زیادہ توجہ دے۔

اسی طرح اگر کوئی طالب علم آپ سے زیادہ علم والا ہو یا عمر میں بڑا ہو تو اس کے ساتھ احترام واکرام سے پیش آنا چاہیے اور کسبِ فیض کے لیے اس سے دعا و سلام اور میل جول رکھنا چاہیے۔ ان سے مجلس کرنے، گفتگو کرنے اور میل جول رکھنے سے آپ کے احاطۂ علم میں اضافہ ہوگا، بلکہ بسا اوقات ایسی علمی چیزیں سامنے آتی ہیں جن سے آپ ناواقف و نا آشنا ہوتے ہیں۔

ان تمام فوائد کے علاوہ اہم اور عظیم فائدہ یہ ہے کہ اس سے حدیث مبارکہ پر بھی عمل ہو جاتا ہے کہ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر رحم کرنا اسلام کی علامت ہے۔ نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا»

''جو شخص چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کی عزت نہیں کرتا اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''[1]

---

[1] صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب اذا أحب الله عبداً، حديث: 4772، جامع الترمذي، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فى رحمة الصبيان، حديث: 1842.

آپس کے تعلق کے لیے مفید امور

1. طلبہ کو آپس میں ایک دوسرے کی اصلاح وخیر خواہی کرتے رہنا چاہیے۔
2. اگر کسی ساتھی کے اخلاق وکردار میں کوئی نقص یا عیب دیکھیں تو علیحدگی میں احسن انداز کے ساتھ اس کی اصلاح کر دینی چاہیے۔ اس عیب کو اچھالنا اور اپنے ہم مکتب ساتھی سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔
3. آپس میں تحائف کا تبادلہ کرتے رہنا چاہیے کیونکہ یہ بفرمانِ نبوی ﷺ محبت بڑھانے کا ذریعہ ہے۔
4. اپنے دوستوں کے لیے ان کی عدم موجودگی میں ان کی خیر و بھلائی اور تعلیم و ترقی کے لیے دعا گو رہنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دعا کو شرف قبولیت سے نوازنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں میں دعا کرنے والے کی محبت پیدا فرماتا ہے۔
5. اگر کوئی ساتھی کھانے پینے کی دعوت دے تو بھر پور خلوص ومحبت کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہیے۔ یہ مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی پر حق ہے۔
6. اگر اسے کوئی مرض لاحق ہو یا کوئی مشکل درپیش ہو تو حتی الوسعت اس کے درد درماں کرنا چاہیے تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے۔
7. خوش مزاجی اور خوش طبعی کو ضرور اپنائیں مگر مذاق و تمسخُر سے احتراز کریں کیونکہ اس سے انسان کا رعب وسنجیدگی ختم ہو جاتی ہے۔
8. اگر کوئی طالب علم ساتھی ذہنی یا مالی طور پر کمزور ہو تو حسبِ استطاعت اس کی مدد کرنی چاہیے تا کہ وہ بھی حصولِ علم میں آپ کا شریکِ سفر ہو سکے۔
9. اپنے دوستوں کو اسباق و دروس کی قراءت و کتابت اور سماعت کی زیادہ سے

زیادہ رغبت دلائیں کیونکہ اصل مقصد یہی ہے، اسے بھولنا نہیں چاہیے۔

10 جو مفید کام یا اچھی چیز اپنے لیے پسند کرے، وہی اپنے ہم مکتب ساتھی کے لیے بھی پسند کرے اور حتی الامکان ہر کام میں دیگر ساتھیوں کو شامل کر کے، اس کام کو اجتماعی طور پر سرانجام دینے کی کوشش کرے تاکہ اس کے جذبۂ محبت سے دیگر ساتھی بھی متأثر ہو کر اس کے ساتھ بھی وہی رویہ اختیار کرنے لگیں۔

ہر طالب علم میں ترقی کی جستجو ہونی چاہیے

اپنے دوستوں اور ہم مکتب ساتھیوں پر ذاتی برتری و امتیاز کی خواہش رکھنا مذموم ہے لیکن علمی ترقی کی جستجو رکھنا قابلِ رشک ہی نہیں بلکہ ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے، اس لیے کہ جب مقابلے کا ماحول پیدا ہوتا ہے تو ہر طالب علم حصولِ علم کے لیے زیادہ سے زیادہ جدوجہد کرتا ہے۔ طلبا اگرچہ تعلیم میں کوئی اعلیٰ مقام نہ بھی حاصل کر پائیں پھر بھی اس جدوجہد سے بڑا علمی فائدہ ہوتا ہے۔ تمام اسباق و دروس کی دہرائی ہو جاتی ہے اور بہت سے علمی فوائد و نکات احاطۂ علم میں آ جاتے ہیں۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ طالب علم حصولِ علم کے علاوہ دیگر معاملات پر کم سے کم توجہ دے کیونکہ حصولِ علم سے بے پروائی اور دیگر معاملات میں دلچسپی عملِ تعلیم و تعلّم میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

اَسلاف میں حصولِ علم کی جستجو

❁ ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں عطاء رحمہ اللہ کے پاس علم حدیث کے حصول کے لیے حاضر ہوا تو ان کے پاس عبداللہ بن عبید بن عمیر رحمہ اللہ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے اپنا مقصدِ آمد بیان کیا تو ابن عمیر رحمہ اللہ نے پوچھا: کیا تم نے

قرآن پڑھا ہے؟ میں نے جواب دیا: نہیں۔ انھوں نے فرمایا: پہلے قرآن پڑھو، پھر علم حدیث کی طرف آنا، چنانچہ میں نے پہلے قرآن کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد دوبارہ عطاء رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کے پاس پھر ابن عمیر رحمہ اللہ بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے سوال کیا: کیا تم نے فرائض سیکھ لیے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں۔ انھوں نے فرمایا: پہلے فرائض کا علم حاصل کرو، پھر علم حدیث پر عبور حاصل کر سکو گے، چنانچہ میں پھر پلٹ آیا اور فرائض سیکھنے کے بعد دوبارہ حاضر خدمت ہوا تو انھوں نے مجھے اپنے حلقۂ درس میں شامل فرمایا اور میں سترہ برس تک ان کے پاس زیر تعلیم رہا۔[1]

❁ سوید بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جامع مسجد دمشق میں سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس سینکڑوں لوگ قرآن کا علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ آپ دس دس لوگوں کے گروپ بنا دیتے۔ ہر گروپ پر ایک ایک نگران مقرر فرما دیتے جو اُن کو پڑھاتا اور ان کی غلطیوں کی اصلاح کرتا۔ اگر نگران کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کرتا۔[2]

❁ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے زیر سایہ علم قراءت حاصل کیا کرتا تھا اور آپ حصولِ علم میں شوق پیدا کرنے کے لیے مجھ پر سختی بھی کیا کرتے تھے۔[3]



① سير أعلام النبلاء: 327/6. ② معرفة القراء الكبار: 38/1. ③ سير أعلام النبلاء: 14/5.

طالب علم کا والدین سے سلوک

مقام ومنزلت اور موضوع کے اعتبار سے یہ بحث بہت اہم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیش تر مقامات پر جہاں اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم صادر فرمایا ہے۔

والدین سے حسنِ سلوک کا حکمِ الٰہی

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِیْمًا ۝ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا﴾

”تیرے پروردگار نے یہ فیصلہ (کرتے ہوئے حکم) فرمایا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بھی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اگر تیری زندگی میں ہی ان میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی بوڑھے ہو جائیں تو انھیں اُف بھی مت کہہ اور نہ ہی انھیں جھڑک، بلکہ ان سے نرم و شائستہ انداز میں بات کر، پھر ان کے لیے رحمت و شفقت

کے بازو پھیلائے رکھ اور یہ دعا کرتا رہ کہ اے میرے پروردگار! تو ان پر ویسے ہی رحم فرما جیسے انھوں نے بچپن میں میری پرورش فرمائی ہے۔"[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے حکم کے ساتھ ہی والدین سے حسن سلوک کا حکم فرما کر اس کی اہمیت کو واضح فرمایا ہے پھر حسن سلوک کا طریق کار بھی بتلا دیا کہ کوئی بھی ایسی ہلکی سی بات بھی ان کے متعلق زبان سے نہ نکلے جس سے انھیں تکلیف پہنچے حتیٰ کہ "اُف" کہنے کی بھی ممانعت ہے جو ہلکا ترین کلمہ ہے بلکہ ان سے نرم مزاجی، خوش طبعی، خوبصورت کلام، باوقار اور با ادب ہو کر مخاطب ہوا جائے تاکہ تمام آدابِ تعظیم و تکریم برقرار رہیں۔ اس کے بعد یہ بھی سبق دے دیا کہ ان کی خدمت میں ہمیشہ بازوئے رحمت بچھائے رکھو، یعنی کبھی ایسا نہ ہونے پائے کہ تم ان سے بے پرواہی برتو، یا ماتھے پہ شکن لاؤ بلکہ عاجزی و انکساری سے خدمت گزار بنے رہو اور ساتھ ساتھ پروردگار کے حضور ان کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا بھی وردِ زبان رکھو۔[2]

والدین سے حسن سلوک کا حکمِ نبوی

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: الصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: بِرُّ الْوَالِدَيْنِ قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ»

---

[1] الاسراء 17: 23، 24. [2] تفسیر ابن کثیر: 3/37، 38.

''میں نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ کون سا عمل سب سے زیادہ فضیلت کا حامل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: وقت پر نماز ادا کرنا۔ میں نے پوچھا: پھر کون سا؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔ میں نے عرض کیا: پھر کون سا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے عبادات کے بعد جس کام کو سب سے مقدم رکھا ہے وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک ہے اور اسے جہاد فی سبیل اللہ پر فوقیت دی ہے تاکہ لوگوں پر اس کی اہمیت وفضیلت ہو جائے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر جہاد پر جانے کی خواہش ظاہر کی تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ کیا تیرے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں زندہ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

فَفِيْهِمَا فَجَاهِدْ.

''تو انھی دونوں میں جا کر جہاد کر۔''[2]

یعنی ان کے پاس رہ کر ان کی خدمت کرتا رہ، تیرا یہی جہاد ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی احادیث سے والدین کی خدمت کی اہمیت اور فضیلت واضح ہوتی ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، كتاب الجهاد، باب فضل الجهاد والسير، حديث:2782 وصحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان كون الايمان بالله،حديث:122. [2] صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب الجهاد باذن الابوين، حديث: 2782 وصحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب برالوالدين ...... الخ، حديث: 4623.

والدین سے حسنِ سلوک کی چند مثالیں

❖ ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ کی والدہ فوت ہوگئیں تو وہ اشکبار ہوکر فرمانے لگے کہ میرے لیے جنت کے دو دروازے کھلے رہتے تھے، یعنی ماں اور باپ زندہ تھے۔ لیکن ان میں سے ایک دروازہ آج بند ہوگیا ہے۔

❖ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی والدہ نے کسی بات پر قسم اٹھائی اور پھر اسے توڑ دیا اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس بارے میں فتویٰ پوچھا کہ اب کیا کیا جائے؟ تو امام صاحب نے بتایا کہ قسم توڑنے پر اتنا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ لیکن ان کی والدہ ان کے فتوے سے مطمئن نہ ہوئیں اور کہنے لگیں کہ مجھے زُرعہ کے پاس لے چلو۔ امام صاحب اپنی والدہ کو زرعہ کے پاس لے گئے اور انھوں نے ان سے اپنی والدہ کے لیے فتویٰ طلب کیا۔ زرعہ رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ آپ نے اپنے بیٹے (ابوحنیفہ) سے اس بارے میں کیوں نہ پوچھ لیا؟[1]

امام صاحب کی والدہ محترمہ نے زرعہ رحمہ اللہ سے یہ جواب سن کر اپنے بیٹے (ابوحنیفہ رحمہ اللہ) کے فتوے پر عمل کرلیا۔

❖ محمد بن بشر بیان کرتے ہیں کہ کوفہ میں منصور بن معتمر رحمہ اللہ اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بڑھ کر اپنی والدہ سے حسن سلوک کرنے والا کوئی نہ تھا۔ منصور اپنی والدہ کو کندھوں پر اٹھا کر قضائے حاجت کے لیے جنگل میں لے جایا کرتے تھے۔[2]

❖ ابن عساکر رحمہ اللہ سے اصبہان میں تاخیر سے پہنچنے کا سبب پوچھا گیا تو فرمانے لگے کہ میری والدہ نے مجھے اجازت نہیں دی تھی۔[3]

---

[1] مناقب ابی حنیفہ: 254/1. [2] مناقب ابی حنیفہ: 255/1. [3] تذکرۃ الحفاظ، ص: 1333.

حیوہ بن شریح رحمہ اللہ لوگوں کو قرآن وسنت کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ جب کبھی پڑھا رہے ہوتے اور والدہ آواز دیتیں تو فوراً کھڑے ہو جاتے اور ان کی بات سنتے۔[1]

محمد بن منکدر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے بھائی عمر نے ساری رات عبادت میں گزار دی اور میں ساری رات اپنی والدہ کی خدمت میں مشغول رہا کیونکہ مجھے نوافل میں رات گزارنے سے ماں کی خدمت میں رات گزارنا زیادہ پسند تھا۔[2]

امام ذہبی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بغدادی رحمہ اللہ کی مجلس میں شریک ہونے کی مجھے بہت خواہش تھی لیکن صرف اس وجہ سے میں وہاں نہ جا سکا کہ میری والدہ کی اجازت نہ تھی۔[3]

والدین سے حسن سلوک، عمر اور رزق میں اضافے کا باعث

والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے جہاں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کی اطاعت واتباع ہوتی ہے وہاں اس کے بہت سے دیگر فوائد بھی ہیں، مثلاً: والدین کی دعائیں حاصل ہوتی ہیں جو ہر میدان میں یقیناً کامیابی کا باعث ہیں، عمر اور رزق میں برکت کی موجب ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُمَدَّ لَهُ فِي عُمُرِهِ وَيُزَادُ فِي رِزْقِهِ فَلْيَبَرَّ وَالِدَيْهِ وَلْيَصِلْ رَحِمَهُ»

”جو شخص یہ پسند کرتا ہو کہ اُس کی عمر دراز ہو اور اس کے رزق میں اضافہ

---

[1] تقریب التهذيب: 1610. [2] تقریب التهذيب: 6367. [3] معرفة القراء الكبار: 552/2.

ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے والدین سے حسنِ سلوک کرے اور اپنے رشتہ داروں سے تعلق جوڑے رکھے۔" [1]

اسی طرح والدین کی خدمت جنت کے حصول کا ذریعہ ہے اور ان کو ستانے اوران سے قطع تعلقی کی وجہ سے انسان جہنم کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ جیسا کہ حدیث ہے:

«اَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا حَقُّ الْوَالِدَيْنِ عَلٰى وَلَدِهِمَا؟ قَالَ: هُمَا جَنَّتُكَ وَنَارُكَ»

"ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اولاد پر والدین کا کیا حق ہے آپ ﷺ نے فرمایا: والدین تمھاری جنت بھی ہیں اور جہنم بھی۔" [2]

مطلب یہ کہ والدین کی خدمت کر کے جنت بھی حاصل کی جاسکتی ہے اور انھیں دکھ دے کر انسان جہنم میں بھی جا سکتا ہے۔

اس لیے ہر ممکن یہی کوشش کرنی چاہیے کہ والدین کی خدمت و اطاعت کر کے اور انھیں خوش رکھ کر اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور جنت حاصل کی جائے نہ کہ ان سے بے پروائی برت کر اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور جہنم کو مول لیا جائے۔

باپ کے مقابلے میں ماں کا مقام ومرتبہ

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ سے سوال کیا:

«يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِي؟ قَالَ

[1] مسند أحمد: 1213. [2] سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب بر الوالدين، حديث: 3662.

أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أَبُوكَ»

''اے اللہ کے رسول ﷺ! لوگوں میں سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا کون حق دار ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمھاری ماں۔ اس نے پوچھا: پھر کون؟ فرمایا: تمھاری ماں۔ اس نے کہا: پھر کون؟ فرمایا: تمھاری ماں۔ اس نے عرض کیا: پھر کون؟ فرمایا: پھر تمھارا باپ۔''[1]

نبی کریم ﷺ نے خدمتِ والدین کے چار حصوں میں سے تین حصوں کی حق دار ماں کو ٹھہرایا اور ایک حصہ باپ کے لیے مقرر فرما کر ماں کی شان وعظمت کی اہمیت وفضیلت اُجاگر فرمائی ہے۔ چونکہ ماں نو ماہ تک بچے کو اٹھائے پھرتی ہے اور پھر بہت سے تکلیف دہ مراحل سے گزر کر اسے جنم دیتی ہے اور پھر سالہا سال تک اس کی پرورش کرتی ہے۔ اس کی ابتدائی تعلیم وتربیت کا فریضہ سرانجام دیتی ہے اور ہر لحاظ سے اسے خود پر ترجیح دیتی ہے، اس لیے نبی ﷺ نے حسنِ سلوک کا زیادہ حق دار ماں کو ٹھہرایا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ والد کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اس بیان سے مقصود ترجیحاً ماں کا خیال رکھنا ہے ورنہ حسن سلوک کے حکم میں دونوں شامل ہیں۔

والدین کی خدمت، جنت کی ضمانت

نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الأدب باب من احق الناس بحسن الصحبة، حديث: 5514 وصحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب بر الوالدين..... الخ، حديث: 4622,4621.

«رَغِمَ أَنْفٌ ثُمَّ رَغِمَ أَنْفٌ ثُمَّ رَغِمَ أَنْفٌ مَنْ أَدْرَكَ أَبَوَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ اَحَدَهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ»

''اس شخص کی ناک خاک آلود ہو، پھر (فرمایا) ناک خاک آلود ہو، پھر (فرمایا) ناک خاک آلود ہو، جس نے اپنے والدین کو بڑھاپے میں پایا، خواہ ایک کو یا دونوں کو اور جنت میں داخل نہ ہو سکا۔''[1]

مراد یہ ہے کہ جس شخص کی زندگی ہی میں اس کے والدین بوڑھے ہو جائیں اور بڑھاپے میں چونکہ انسان عاجز و بے بس ہو جاتا ہے اور دوسروں کا محتاج ہوتا ہے، اس لیے اگر وہ اس عمر میں بھی ان کی خدمت نہیں کرتا تو گویا وہ جنت میں داخلے سے محروم ہو جاتا ہے۔ نبی ﷺ نے ایسے شخص کی بدبختی کے باعث اسے رَغِمَ أَنْفٌ (ناک خاک آلود ہو) کی وعید فرمائی ہے۔

لہٰذا ہر انسان کے لیے بالعموم اور طالب علم کے لیے بالخصوص یہ لازم ہے کہ وہ والدین کی خدمت کو اپنا شعار بنائے اور اپنے لیے حصولِ جنت کا سامان کرے۔



[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب رغم انف من ادرك ابويه او احدهما، حدیث: 4627.

طالب علم کا معاشرتی کردار

طالب علم لوگوں کے لیے نمونہ بنے

طالب علم کو اپنے اقوال، اعمال اور اخلاق و کردار میں دوسروں کے لیے نمونہ ہونا چاہیے۔ اس میں ایسی کوئی ایک بھی ایسی عادت نہیں پائی جانی چاہیے جسے دیکھ کر لوگ اس کے علم، اساتذہ یا والدین کو مطعون کریں۔ اس کے لیے اسے جہاں اپنے اخلاق و کردار کو سنوارنے کی ضرورت ہے وہاں وہ رب تعالیٰ سے دعا گو بھی رہے کہ مولا کریم! میرے عیوب کی پردہ پوشی فرما اور میری نیکیوں کو قبول کر کے مجھے اپنا اور لوگوں کا محبوب بنا دے۔ لوگوں کے ہاں محبوب ہونا اللہ تعالیٰ کا ایسا انعام ہے جو مسلمان کو دنیا میں حاصل ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہوتا ہے جسے وہ چاہتا ہے اس سے سرفراز فرماتا ہے۔ جیسا کہ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا نَادٰى جِبْرِيْلَ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبَّهٗ، فَيُحِبُّهٗ جِبْرِيْلُ فَيُنَادِيْ جِبْرِيْلُ فِيْ أَهْلِ السَّمَاءِ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهٗ أَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْأَرْضِ»

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو فرماتا ہے کہ اللہ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے لہذا تو بھی اس سے محبت رکھ، پھر جبریل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اہلِ آسمان میں یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت فرماتا ہے سو تم بھی اس سے محبت کرو تو اہل آسمان بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین پر بھی (لوگوں کے دلوں میں) اس کی محبت ومقبولیت ڈال دی جاتی ہے۔''[1]

دل کو بغض ونفرت سے پاک رکھے

طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل کو لوگوں کے بارے میں صاف رکھے۔ اس میں کسی طرح کا بغض وعناد اور کینہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کسی میں کوئی برائی ہو تو احسن انداز سے اس کی اصلاح کر دینی چاہیے۔ اس سے نفرت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ صاحبِ علم کے شایانِ شان نہیں ہے کہ جس دل میں قرآن وسنت کا علم ہو اسی دل میں لوگوں کے لیے بغض ونفرت بھی ہو، بلکہ ہر ممکن طریقے سے اپنے دل کو بغض وعناد سے پاک اور لوگوں کے لیے خیر خواہ بنانا چاہیے کیونکہ اسلام ایک ایسا معاشرہ بسانا چاہتا ہے جس میں تمام انسان ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں، خوشی وغمی میں ایک دوسرے کے ساجھی ہوں اور جملہ معاملاتِ زندگی میں باہم شیر وشکر رہیں۔

زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابو دجانہ رحمہ اللہ ایک مرتبہ شدید بیمار ہو

[1] صحیح البخاري، کتاب الأدب، باب المقة من اللّٰہ تعالیٰ، حدیث:6040، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب إذا أحب اللّٰہ عبدًا حببه لعباده، حدیث:6981.

گئے تو انھوں نے فرمایا: میری نظر میں تمام اعمال سے بڑھ کر دو عمل بہت اہمیت رکھتے ہیں: ایک یہ کہ میں بے فائدہ اور فضول گفتگو نہ کروں اور دوسرا یہ کہ میرا دل تمام مسلمانوں کے لیے خیر خواہ رہے۔[1]

امام یحییٰ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں جب بھی کسی شخص کے عیب دیکھتا ہوں تو ان پر پردہ ڈالتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ اسے علیحدگی میں سمجھا دوں تاکہ اس کی اصلاح ہو جائے۔ اگر وہ نصیحت کو قبول کرنے والا ہو تو اسے وہ بات کہہ دیتا ہوں، ورنہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیتا ہوں۔[2]

خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنائے

طالب علم کو پڑھنے پڑھانے کے عمل پر ہی اکتفا نہیں کر لینا چاہیے بلکہ خدمتِ خلق بھی ایک اخلاقی فریضہ ہے، جسے حسب استطاعت سرانجام دیتے رہنا چاہیے۔ اس سے جہاں آپ لوگوں کے دل میں اپنے لیے مقام پیدا کر سکیں گے وہاں یہ دنیوی و اخروی زندگی میں بھی بے شمار آسانیوں اور حصولِ نجات کا ذریعہ ہے۔

نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ اَخِيْهِ»

---

[1] سیر أعلام النبلاء: 243/1. [2] سیر أعلام النبلاء: 83/11.

''جو شخص دنیا میں اپنے مسلمان بھائی کی کوئی تکلیف دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کی تکالیف کو دور فرمائے گا۔ جو شخص کسی کی مشکل کو آسان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دنیوی و اُخروی مشکلات کو آسان فرما دیتا ہے۔ جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کی مدد فرماتا ہے جو اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا ہے۔'' [1]

رسول کریم ﷺ کے اس فرمان سے معلوم ہوا کہ دوسروں کی خدمت کرنا بھی گویا اپنے لیے ہی آسانیاں، عیوب کی پردہ پوشی، دنیا و آخرت میں نصرتِ الٰہی اور نجات و مغفرت کا سامان کرنے کے مترادف ہے، لہٰذا ہر طالب علم کو چاہیے کہ وہ اس بیش قدر عمل کو اپنائے تاکہ وہ دوسروں کے کام آنے کے ساتھ ساتھ خود بھی فلاح و نجات سے ہمکنار ہو سکے۔

بردباری اور نرم مزاجی کو اپنائے

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴾

''عفو و درگزر کو اختیار کیجیے، نیکی کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے اعراض کیجیے۔'' [2]

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں رقم طراز ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں امر بالمعروف کا ذکر فرما کر جملہ عبادات اور تمام فرائض کو اس میں شامل

[1] صحیح مسلم، کتاب العلم، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن، حدیث: 4867.
[2] الأعراف 7:199.

فرما دیا ہے اور جاہلوں سے اعراض برتنے (دور رہنے) کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ انھیں احکام و مسائل یا علم کی کوئی بات بتلانے سے بھی گریز کیا جائے بلکہ یہ حکم صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو حق کی بات کو سننا ہی نہیں چاہتے اور اگر سنتے ہیں تو اپنی ڈھٹائی کے باعث قبول نہیں کرتے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو وہ جو ہدایت کی بات سننا گوارہ ہی نہیں کرتے اور اگر سن بھی لیں تو بجائے قبول کرنے کے اپنی جہالت پر قائم رہتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو جہالت کے باعث راہِ ہدایت سے دور جا چکے ہیں لیکن اگر انھیں شائستہ انداز اور نرم مزاجی سے سمجھایا جائے تو وہ نہ صرف بات کو سنتے ہیں بلکہ اسے مانتے بھی ہیں۔ ایسے لوگ قابل ستائش ہیں۔[1]

انھی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ لَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَ لَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴾

”نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی۔ (برائی کو) احسن انداز سے دور کیجیے۔ اس سے آپ کا دشمن بھی آپ کا جگری دوست بن جائے گا۔“[2]

سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو خط لکھا، جس میں سلام و دعا کے بعد ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا ہے کہ مجھے مال و اولاد سے نوازا ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ کثرت مال و اولاد خیر و بھلائی کی علامت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل یہ ہے کہ آپ کا اخلاق و کردار

[1] تفسیر ابن کثیر: 289/2. [2] حمٓ السجدة 41:34.

بہتر ہو، آپ بردباری و نرم مزاجی کو اپنائیں اور عالم باعمل ہوں۔[1]

ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ امام احنف رحمہ اللہ سے کوئی شخص جھگڑ پڑا اور بات طول پکڑ گئی تو وہ کہنے لگا: اگر اب تو نے ایک بات بھی کہی تو مجھ سے دس سنے گا۔ آپ نے فرمایا: اگر تو دس کہے گا تو مجھ سے ایک بھی نہیں سنے گا۔[2]

ہمیشہ تواضع وانکسار اختیار کرے

تواضع انبیاء علیہم السلام کے اخلاقیات کا ایک اہم جز ہے۔ یہ عزت و رفعت کا باعث اور مساوات کا درس دیتا ہے۔ نبی مکرم ﷺ کا فرمانِ عالی شان ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ أَوْحٰى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ وَلَا يَبْغِيْ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ»

''بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی فرمائی ہے کہ تم تواضع و انکساری اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور نہ ہی کوئی کسی پر زیادتی کرے۔''[3]

امام ابن قیم رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ تواضع سے مراد اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنے نفس میں پائے جانے والے احساسِ برتری (اطاعت سے انکار کے جذبے) کو ختم کرنا اور لوگوں کے لیے جذبۂ خدمت ومحبت بیدار رکھنا ہے، پھر اس عمل کی اس قدر پابندی کرنا کہ انسان دوسروں پر اپنا کوئی حق نہ سمجھے بلکہ خود پر دوسروں کے حقوق لازم سمجھے اور لوگوں کو اپنے آپ سے بہتر سمجھے۔

[1] سير أعلام النبلاء: 548/1. [2] سير أعلام النبلاء: 93/4. [3] صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها، باب الصفات التي يعرف بها، حديث: 2865.

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جس شخص میں خود پسندی کی عادت پائی جائے اسے چاہیے کہ وہ اپنے عیوب پر نظر دوڑائے۔ جو شخص خود کو دیگر لوگوں کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل سمجھتا ہو تو یہ اس کا اخلاقی عیب ہے۔ اسے اس عیب کو دور کرنا چاہیے۔ اگر وہ اپنے آپ کو غلطیوں اور خامیوں سے پاک سمجھے تو وہ جان لے کہ وہ ایک دائمی مرض میں مبتلا ہے اور جو خود کو دیگر لوگوں سے ممتاز سمجھے وہ ضعیف العقل اور جاہل ہے۔"[1]

امام عبداللہ بن سلام رحمہ اللہ ایک مرتبہ سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے بازار سے گزر رہے تھے تو کسی نے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی زحمت اور تکلیف اٹھانے سے بچایا نہیں ہوا؟ (یعنی آپ کو مال وزر سے نوازا ہے تو آپ یہ کام کسی اور سے کروا لیتے)۔ انھوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں لیکن میں اپنے نفس کو تکبر سے پاک رکھنا چاہتا ہوں۔[2]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے آپ سے کسی مسئلے کی وضاحت طلب کی تو آپ نے اسے وہ مسئلہ بتلا دیا۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے ایک دعائیہ کلمہ بولا جس کا مفہوم یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی وجہ سے اسلام کو عزت بخشی۔ یہ سن کر امام احمد رحمہ اللہ غضب ناک ہو گئے اور فرمایا کہ اسلام کے آگے میں کیا حیثیت رکھتا ہوں؟ بلکہ اسلام کی بدولت اللہ تعالیٰ نے مجھے عزت بخشی ہے۔[3]

1 الأخلاق والسير في مداواة النفوس، ص: 66. 2 سير أعلام النبلاء، ص: 419.
3 طبقات الحنابلة: 298/1.

تواضع و انکساری اختیار کرنے سے انسان کو معاشرے میں عزت و احترام کا مقام ملتا ہے۔ جبکہ تکبر و غرور نہ صرف اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے بلکہ اس کا مرتکب جنت میں داخلے سے بھی محروم رہے گا، جیسا کہ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ»

''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا۔''[1]

عہد و پیمان کی پاسداری کرے

اللہ تعالیٰ نے عہد و پیمان کی پاسداری کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے بلکہ بہت سے انبیاء و رسل صلوات اللّٰہ و سلامہ علیھم کی اس صفت کو بطورِ خاص ذکر فرمایا ہے جیسا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّهُۥ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ﴾

''یقیناً وہ وعدے کو سچ کر دکھانے والے تھے۔''[2]

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے وعدے کی خلاف ورزی کو نفاق کی ایک علامت قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا إِذَا

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب تحريم الكبرو بيانه،حديث:133,131. [2] مريم 54:19.

حَدَّثَ کَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ»

"تین خصلتیں جس شخص میں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس شخص میں اِن میں سے ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی۔ (وہ تین خصلتیں یہ ہیں:) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔" [1]

ہر مسلمان کے لیے بالعموم اور طالب علم کے لیے بالخصوص ضروری ہے کہ وہ ان مذموم خصائل سے دور رہے۔

ایفائے عہد کے متعلق ایک خوبصورت شعر ہے ؎

إِذَا قُلْتَ فِي شَيْءٍ نَعَمْ فَأَتِمَّهُ ... فَإِنَّ نَعَم دَيْنٌ عَلَى الْحُرِّ وَاجِبٌ

وَإِلَّا فَقُلْ لَا وَاسْتَرِحْ وَأَرِحْ بِهَا ... لِئَلَّا يَقُوْلَ النَّاسُ إِنَّكَ كَاذِبٌ

"جب تو کسی معاملے میں نَعَمْ کہہ دے (یعنی کوئی کام کرنے کی حامی بھر لے) تو پھر اس پر پورا اُتر کیونکہ نَعَمْ (ہاں کہنا) ایک قرض ہے جس کا ادا کرنا واجب ہے اور اگر تو وہ کام نہ کر سکتا ہو تو لَا کہہ دے (یعنی صاف انکار کر دے) اس سے تُو سکون میں بھی رہے گا اور اِس بات سے بھی محفوظ رہے گا کہ لوگ تجھے جھوٹا کہیں۔"

خوش کلامی اور خوش طبعی کو اپنائے

لوگوں سے مخاطب ہوتے وقت آداب گفتگو کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور عمدہ اور اچھے

[1] صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب علامات المنافق، حديث: 34 صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب لايدخل الجنة الاالمؤمنون، حديث: 58.

انداز میں گفتگو کرنی چاہیے تاکہ آپ کا مخاطب آپ کی بات کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کے اخلاق سے بھی متأثر ہو۔ نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«لَنْ تَسَعُوا النَّاسَ بِأَمْوَالِكُمْ فَلْيَسَعْهُمْ مِّنْكُمْ بَسَطُ الْوَجْهِ»

''تم اموال کے ذریعے لوگوں میں ہرگز مقام نہیں حاصل کر سکتے۔ اگر تم میں سے کوئی لوگوں پر غلبہ و مقام چاہتا ہے تو وہ خوش مزاجی کو اپنائے۔''[1]

یعنی لوگوں کے دلوں میں اپنا اچھا مقام پیدا کرنے کا یہ بہترین نسخہ ہے اور اسے صرف دنیوی فائدہ ہی نہ سمجھا جائے بلکہ نبی کریم ﷺ نے اسے بھی عبادت کا درجہ دیا ہے جیسا کہ فرمایا:

«تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ صَدَقَةٌ»

''اپنے (مسلمان) بھائی کے روبرو مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔''[2]

یہ عمل اگر صدقے کے قائم مقام ہے تو اس کی جزا بھی لازم ہے، چنانچہ خوش کلامی اور خوش طبعی کا وصف دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بے شمار فوائد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

مشکل و مُبہم کلمات و اصطلاحات کا استعمال نہ کرے

وعظ و بیان کرتے ہوئے عام لوگوں کے سامنے حتی الامکان آسان اور عام فہم گفتگو کرنی چاہیے اور مشکل کلمات و عبارات اور اصطلاحات کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے اور اگر غیر ارادی طور پر کوئی پیچیدہ کلمہ زبان سے نکل جائے تو فوری طور

1 فتح الباري: 459/10. 2 جامع الترمذي، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في صنائع المعروف، حديث: 1965.

پر اس کی وضاحت کر دینی چاہیے تاکہ لوگ آپ کی مراد و مقصود کو سمجھ سکیں۔

امام اصمعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب ابوعمرو بن علاء رحمہ اللہ کلام کرتے تو یوں گمان ہوتا کہ جیسے انھیں فصاحت و بلاغت سے کچھ واسطہ ہی نہیں ہے کیونکہ وہ بہت ہی آسان اور عام فہم گفتگو کیا کرتے تھے۔ حالانکہ آپ قراءت و لغت کے امام تھے۔[1]

گفتگو کرتے ہوئے ارادۃً مشکل عبارات و اصطلاحات استعمال کرنا اور پیچیدہ کلمات بولنا سننے والوں کے لیے تکلیف دہ معاملہ ہے کیونکہ اس سے لوگ مقصودِ کلام سمجھ نہیں پاتے اور فصاحت و بلاغت کے پیچ و خم میں ہی اُلجھے رہتے ہیں، البتہ علمی مجالس میں یا جہاں تمام حاضرین اہل علم ہوں اور وہ ایسی گفتگو سمجھنے کی بہ خوبی اہلیت رکھتے ہوں تو وہاں بلاتکلف علم وادب سے مزین گفتگو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن تب بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ بہ تکلف ایسی گفتگو نہ کرے کیونکہ تکلف کے ساتھ ایسا کرنے والے کے بارے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ہے:

''کیا میں تمھیں اس امت کے بدترین لوگوں کا نہ بتلاؤں؟ وہ لوگ جو بہت زیادہ باتیں کرتے ہیں، باچھیں ہلا ہلا کر بولتے ہیں اور بہت بڑھا چڑھا کر بات کرتے ہیں۔''[2]

صبر و تحمل اور برداشت سے کام لے

بسا اوقات مخاطب حضرات بہت زیادہ سوالات کرنے لگتے ہیں تو صبر و تحمل

[1] سير أعلام النبلاء: 410/6. [2] السنن الكبرىٰ للبيهقي: 194/10.

سے ان کے سوالات کو سننا اور پھر ان کا احسن انداز سے جواب دینا چاہیے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سائل جہالت یا نقصِ فہم کی بنا پر نازیبا کلمات بولنے لگتا ہے تو ایسے موقع پر برداشت سے کام لینا چاہیے اور ان کو انھی کے انداز میں جواب دینے کے بجائے انتہائی اچھے اور سُلجھے ہوئے انداز میں تسلی بخش جواب دینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو بھی اسی کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ﴾

''اور اگر آپ تُند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے گرد و پیش سے بھاگ جاتے۔''[1]

نبی مکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے، اس لیے ہمیں لوگوں کے کثرت سوال یا منفی رویے پر صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے اور ان کی راہنمائی کرنے سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ اسلاف کی متعدد مثالیں ہمارے سامنے ہیں، ان میں سے دو ایک کو ہم زینتِ قرطاس کرتے ہیں:

1. امام عمرو بن حارث مصری رحمہ اللہ جب اپنے گھر سے نکلتے تو لوگ قطار در قطار آپ کے انتظار میں کھڑے ہوتے۔ وہ آپ سے قرآن و حدیث، شعر و ادب اور فقہ کے مسائل پوچھتے اور آپ ان کا تسلی بخش جواب دیا کرتے۔[2]

2. امام مالک رحمہ اللہ درسِ حدیث کے علاوہ علمی مجالس میں شرکت فرماتے، مریضوں کی عیادت کرتے، جنازوں میں حاضر ہوتے اور لوگوں کے مسائل کے جواب بھی دیا کرتے تھے۔[3]

---

[1] آل عمران 3:159. [2] سير أعلام النبلاء: 6/353. [3] سير أعلام النبلاء: 8/64.

مناسب اوقات و حالات میں وعظ کرے

ہر وقت اور ہر حالت میں وعظ و نصیحت کرنا بے اثر ہو جاتا ہے بلکہ دعوت و تبلیغ کا اصول یہ ہے کہ مناسب وقت اور حالت دیکھ کر وعظ کیا جائے تا کہ آپ کے مخاطبین مکمل دلجمعی اور شوق و رغبت سے آپ کا وعظ بھی سن سکیں اور آپ کی بات ان کے دلوں پر اثر انداز بھی ہو سکے، ورنہ موقع بے موقع اور لوگوں کے مزاج پرکھے بغیر گفتگو اور وعظ کرنا خود اپنی اور عملِ تبلیغ کی ناقدری ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوا، بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوا»

''آسانی پیدا کرو اور سختی نہ برتو، خوشخبری سناؤ اور نفرت نہ دلاؤ۔''[1]

اسی طرح حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ہر جمعرات کو لوگوں کو وعظ فرمایا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا: اے ابو عبدالرحمٰن! میری خواہش ہے کہ آپ ہمیں ہر روز وعظ کیا کریں تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمھیں اس لیے روزانہ وعظ نہیں کرتا تا کہ تم اُکتا نہ جاؤ۔ نبی ﷺ نے بھی وعظ کے لیے ہمارے لیے کچھ دن مقرر فرمائے ہوئے تھے کہ کہیں ہم اُکتا نہ جائیں۔[2]



---

[1] صحيح البخاري، كتاب العلم، باب ما كان النبي يتخولهم بالموعظة، حديث: 69.

[2] صحيح البخاري، كتاب العلم، باب من جعل لأهل العلم أياماً معلومة، حديث: 70.



طالب علم کا کتب سے تعلق

مطالعۂ کتب کا شوق وشغف

مثالی طالب علم کا کتب سے تعلق اور وابستگی ہونا مسلّم امر ہے کیونکہ مطالعۂ کتب کے شوق وشغف سے انسان علم وفن کی بہت سی منازل طے کرتا ہے۔علم ایک سمندر ہے اور سمندر سے لعل و گوہر نکالنا مشکل نہیں ہے۔لیکن اس کے لیے کتاب سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔کتاب بہترین دوست اور راہ نما ہے۔اس سے تعلق قائم ہوجائے تو پھر مدینۃ العلم جانے کے سارے راستے آسان ہوجاتے ہیں۔زندگی کے ہر معاملے اور ہر موڑ پر انسان کو علم کی ضرورت ہے اور حصولِ علم کا بڑا ذریعہ کتاب ہی ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہ نمائی کے لیے کتابیں نازل فرمائیں۔علم حاصل کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد ہورہے ہیں۔لائبریری اکتسابِ علم کا بڑا مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔طلبا واساتذہ تحقیق ومطالعے کے لیے لائبریریوں سے استفادہ کرتے ہیں اور لائبریریاں علم کی منازل طے کرنے کا ایک لازمی اور اہم ذریعہ بن چکی ہیں۔ ہزاروں موضوعات پر مشتمل کتب ایک چھت تلے بآسانی میسر ہوتی ہیں ، اس لیے طالب علم کے لیے لائبریریوں سے تعلق استوار رکھنا ضروری امر ہے۔

طالب علم کی بہترین مصروفیت

فارغ اوقات میں بہتر مصروفیت طالب علم کے لیے یہی ہے کہ وہ مطالعۂ کتب میں مشغول رہے۔ اس سے ذوقِ مطالعہ بھی بڑھتا ہے اور وقت بھی ضائع ہونے کے بجائے بہترین کام میں صَرف ہوتا ہے۔

امام ابن القیم الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں حسن بن احمد الہمدانی رحمہ اللہ کو دیکھا کہ ان کے اردگرد کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور وہ ان کے مطالعے میں مشغول ہیں تو میں نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: میں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ میری ایسے کام کی طرف راہنمائی فرما جو دنیا میں میری بہترین مشغولیت کا باعث ہو تو اللہ تعالیٰ نے مجھ میں مطالعۂ کتب کا ذوق پیدا فرما دیا۔[1]

کتب خریدنا حصولِ علم کا حصہ ہے

نصابی و غیر نصابی کتب طالب علم کے لیے عظیم سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں، لہٰذا کتب خریدنے اور جمع کرنے کا شوق ہر طالب علم کو ہونا چاہیے کیونکہ علوم وفنون کے حصول میں کتب کا اہم کردار ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ حصول علم میں بطورِ معاون کون سی چیز زیادہ اہمیت کی حامل ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو علم سے بے بہرہ رکھنا چاہتا ہو، اُس سے کتابوں کا شوق ورغبت ختم کر دیتا ہے۔[2]

---

[1] طبقات الحنابلة: 319/1. [2] مجموعة الرسائل الكبرىٰ: 239/1.

کتب خریدتے وقت ملحوظ امور

کوئی بھی کتاب خریدتے وقت درج ذیل امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

1. کتاب خریدنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا کتب کا ذوق رکھنے والے طلبہ سے مشورہ کر لینا چاہیے کہ فلاں موضوع پر کون سی اور کس مؤلف کی کتاب بہتر ہے۔
2. اگر کسی کتاب کی شرح خریدنا ہو تو پہلے دیکھنا چاہیے کہ کیا اس کی ایک ہی شرح ہے یا متعدد شروحات موجود ہیں۔ اگر اس کی متعدد شروحات ہوں تو پھر ان میں سے جامع شرح کا انتخاب کرنا چاہیے۔
3. اگر علم و جامعیت کے اعتبار سے تمام یکساں ہوں تو پھر طباعت کا معیار ملحوظ رکھنا چاہیے اور جس کی طباعت عمدہ ہو اسے خریدنا چاہیے۔
4. اگر معیارِ طباعت میں بھی تمام کتب ایک سی ہوں تو پھر تخریج و تحقیق میں اعلیٰ معیار والی کتاب خریدنی چاہیے۔
5. اگر کتاب کی ایک سے زائد جلدیں ہوں تو اُس کتاب کا انتخاب کرنا چاہیے جو کم سے کم ضخامت اور کثیر فوائد کی حامل ہو۔
6. کتاب کے تمام اوراق کو ایک نظر دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں درمیان میں کسی صفحے کی طباعت یا ترتیب میں کوئی خرابی تو نہیں۔
7. عام اور اعلیٰ طباعت کی صورت میں مضبوط جلد کا نسخہ خریدنا چاہیے۔
8. اگر کتاب بڑی ہو اور اسے بنظر غائر دیکھنا ممکن نہ ہو تو صرف فہرست دیکھ لینی چاہیے۔ اس سے کتاب کا سرسری مطالعہ ہو جاتا ہے۔

مطالعے کے لیے عاریتاً کتاب دینا

اگر کوئی طالب علم اتنی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ وہ ہر کتاب خرید سکے، یا مطلوبہ کتاب فی الوقت بازار میں دستیاب نہ ہو تو بغرض مطالعہ اسے اپنی کتاب عاریتاً دے دینی چاہیے کیونکہ یہ بھی ایک نیکی اور علم کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے بلکہ یہ ایسا صدقہ ہے جس کا اجر کتاب کے مؤلف، ناشر، عاریتاً دینے والے اور مستعار لینے والے کو ملتا رہتا ہے جبکہ ان کی نیت فقط رضائے الٰہی کا حصول ہو۔

محمد بن مزاحم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أَوَّلُ بَرَكَةِ الْعِلْمِ إِعَارَةُ الْكُتُبِ.

''علم کی پہلی برکت کتب ادھار دینے میں ہے۔''[1]

کتاب عاریتاً دینے کے اصول

کتاب عاریتاً (بطور ادھار) دینے کے لیے درج ذیل اصول وضوابط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

- کتاب کا مواد فکر و عقیدے کے لیے ضرر رساں نہ ہو کہ وہ پڑھنے والے کے ذہن کو پراگندہ کر دے اور اس کو غلط فکر کا حامل بنا دے اور اگر کتاب دینا ضروری ہو تو پھر دیتے وقت، اس کی وضاحت کر دینی چاہیے اور اس کے مشکل و پیچیدہ اور وضاحت طلب امور کی نشان دہی اور اُن کا حل بھی بتا دینا چاہیے۔
- مطالعہ کے لیے کتاب عاریتاً لینے والا اس کا اہل ہو کہ اسے کتاب دی جائے

[1] أدب الإملاء والاستملاء، ص: 175.

یعنی وہ اس کی اہمیت وافادیت جانتا ہو اور اس کی حفاظت کر سکتا ہو۔

3. اگر کتاب کے دو نسخے ہوں یعنی اعلیٰ طبع اور ادنیٰ طبع تو ادنیٰ طبع کا نسخہ دینا چاہیے تاکہ اگر وہ اسے خراب یا گم کر دے تو زیادہ پریشانی نہ ہو۔

4. اگر کوئی شخص آپ سے ایک مرتبہ کتاب عاریتاً لیتا ہے اور وقتِ مقررہ پر واپس نہیں کرتا یا کتاب کی حالت بگاڑ کر واپس کرتا ہے تو آئندہ اسے ہرگز کتاب نہیں دینی چاہیے۔ یہ عمل ایک سوراخ سے دو بار ڈسے جانے کے مترادف ہے۔

5. اگر آپ نے مختلف علوم وفنون کی کتب پر مشتمل ایک لائبریری قائم کر رکھی ہو تو ایک کاپی یا رجسٹر اس کام کے لیے مخصوص کر لیجیے کہ آپ جو بھی کتاب دیں اس کتاب کا نام، مؤلف کا نام، مطبع کا نام، کتاب لینے والے کا نام، تاریخ اور تاریخ واپسی کا اندراج اس رجسٹر میں کر لیں، بلکہ کتاب لینے والے کا رابطہ نمبر بھی نوٹ کر لیں تاکہ وقتِ مقررہ سے تاخیر کے باعث اس سے رابطہ کر سکیں۔

کتاب مستعار لینے کے آداب

کتاب مستعار لینے والے کو بھی درج ذیل آداب کا خیال رکھنا چاہیے:

1. اسے چاہیے کہ وہ وقت مقررہ پر کتاب واپس کرے اور بغیر معقول عذر کے عمداً تاخیر نہ کرے۔

2. اگر وقت مقررہ سے پہلے ہی وہ کتاب کا مطالعہ کر چکا ہو تو اسے مقررہ تاریخ کا انتظار نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسی وقت واپس کر دینی چاہیے تاکہ کوئی اور بھی اس سے فائدہ اٹھا سکے۔

3. کتاب لے کر رکھ نہیں چھوڑنی چاہیے بلکہ فوری اس کا مطالعہ شروع کر کے

زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

4 کتاب پر حواشی یا نوٹس وغیرہ لکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے، البتہ اگر آپ صاحبِ کتاب سے اجازت حاصل کر چکے ہوں تو کوئی حرج نہیں۔

5 کتاب کو مکمل حفاظت اور اہتمام سے رکھنا چاہیے، کوئی صفحہ نہ پھٹے اور نہ ہی جلد خراب ہو۔

6 کتاب واپس کرتے وقت احسان مندی اور شکر گزاری کا انداز اپنانا چاہیے اور دعائیہ کلمات کے ساتھ کتاب دینے والے کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

7 کتاب گم کر دینا انتہائی بُری حرکت ہے۔ ایسا کرنے والا شخص دوبارہ کتاب لینے کا قطعًا حق دار نہیں ہے کیونکہ اس نے صاحبِ کتاب کا نقصان کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے دیگر لوگوں کو بھی کتاب سے استفادہ کرنے سے محروم کر دیا، لہٰذا ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ نئی کتاب خرید کر دے، یا پھر صاحبِ کتاب کو اس کی قیمت ادا کرے۔



طالب علم اور حفظِ قرآن

حفظِ قرآن کی اہمیت

اہل علم کی نظر میں حفظِ قرآن ان بنیادی امور میں سے ہے جن سے طالب علم حصولِ علم کی ابتدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف میں سے کوئی بھی امام ایسے نہیں گزرے جو حدیث و فقہ کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن کے حافظ نہ ہوں بلکہ زمانۂ اسلاف میں عالم غیر حافظ کا تصور ہی نہیں ہوتا تھا اور اگر کوئی حدیث و فقہ کا تو علم حاصل کرتا لیکن قرآن حفظ نہ کرتا تو اسے بہت معیوب سمجھا جاتا تھا، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تقریب التھذیب میں عثمان بن محمد بن ابی شیبہ کے متعلق لکھتے ہیں:

ثِقَةٌ حَافِظٌ شَهِيرٌ وَلَهُ أَوْهَامٌ وَقِيلَ كَانَ لَا يَحْفَظُ الْقُرْآنَ.

''قابلِ اعتماد اور مشہور و معروف حافظ حدیث ہیں۔ روایت حدیث میں غلطیاں کر جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں قرآن یاد نہیں تھا۔''

اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حفظ قرآن دیگر تمام علوم کے حصول کے لیے چابی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے تقرّب الی اللہ حاصل ہوتا ہے۔ ذہنی استعداد میں اضافہ اور اسباق و دروس کو زبانی یاد کرنے اور یاد رکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی

ہے اور یہ صلاحیت تمام قسم کے علوم کے لیے ضروری ہے۔ اس لحاظ سے حفظِ قرآن کا محض یہی فائدہ نہیں ہے کہ اللہ کا کلام اَز بر ہو جاتا ہے بلکہ ایسی برکت اور تقویت حاصل ہو جاتی ہے کہ جس کی بدولت دوسرے علوم کو سیکھنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

حفظِ قرآن کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے حافظِ قرآن کو دنیوی، برزخی اور اُخروی زندگیوں میں تمام لوگوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔

دنیا میں اس طرح کہ نبی مکرم ﷺ نے لوگوں کی امامت کا حق دار حافظِ قرآن کو ٹھہرایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«يَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ......الخ»

''لوگوں کی امامت وہی شخص کروائے جو تمام لوگوں سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہو۔'' [1]

❁ آپ ﷺ کا قاریٔ قرآن کو لوگوں کی امامت کے لیے منتخب کرنا اس کے اعلیٰ مقام ومنزلت اور شرف وعزت کی دلیل ہے۔

❁ برزخی زندگی میں اعلیٰ مقام ومرتبہ کے حامل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جب جنگِ احد کے موقع پر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تو ان کی الگ الگ تدفین کرنا مشکل محسوس ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ سے ایک ہی قبر میں دو یا تین شہداء کو دفن کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرما دی اور شہداء کی تدفین کے موقع پر آپ ﷺ فرماتے:

---

[1] صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب من أحق بالإمامة، حديث: 1079,1078.

«أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخِذًا لِلْقُرْآنِ»

''ان میں سے قرآن زیادہ یاد رکھنے والا کون ہے؟''

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس شہید کی طرف اشارہ کرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے پہلے قبر میں اتارتے۔ 1

❁ آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ حافظِ قرآن کو بلند درجات پر فائز فرمائے گا، جیسا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ فَإِنَّ مَنْزِلَتَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَأُهَا»

''حاملِ قرآن سے ارشاد ہو گا: قرآن پڑھتا جا اور جنت کی منازل طے کرتا جا اور خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، بے شک تیرا مقام وہی ہو گا جہاں تو آخری آیت ختم کرے گا۔'' 2

حفظِ قرآن کے لیے شوق و محنت

ہر طالب علم کو سب سے پہلے قرآن کا علم حاصل کرنے کا شوق ہونا چاہیے تاکہ حصول علم جیسے مقدس مقصد کا آغاز کتاب اللہ کی تعلیم سے کیا جائے۔ اس سے حصولِ برکت کے ساتھ ساتھ حصولِ علم میں درپیش تمام مشکلات رفع ہو جاتی ہیں اور تمام منازل آسان ہو جاتی ہیں۔ کسی بھی طالب علم کو اس وجہ سے احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ میں ذہین نہیں ہوں، میرا حافظہ کمزور ہے یا شدید محنت

---

1 صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب الصلاة على الشهيد، حديث: 1257. 2 مسند أحمد: 6500.

کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے، لہٰذا میرے لیے حفظ کرنا بہت مشکل امر ہے۔ یہ تمام باتیں نہایت کمزور وجوہات اور شیطانی وسوسے ہوتے ہیں جنھیں ذوق وشوق بیدار رکھ کر محنت و جدوجہد کے ذریعے سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ پیدائش کے وقت کوئی انسان بھی علوم کا ماہر پیدا نہیں ہوتا، ہر کوئی بعد میں ہی سیکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْــًٔا ﴾

''اللہ تعالیٰ نے (جب) تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا تو تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔''[1]

یعنی کوئی بھی شخص ماں کے رحم سے کچھ حاصل کر کے نہیں آتا بلکہ اپنی محنت اور شوق و رغبت سے ہی ہر مقصد کا حصول ممکن بناتا ہے، اس لیے اگر شوق بیدار ہو اور محنت سے کام لیا جائے تو ذہانت و فطانت اور قوتِ حافظہ سے قطع نظر ہر طالب علم اپنے سینے کو قرآن سے منور کر سکتا ہے۔

ترجمہ و تفسیر کا علم

صرف قرآن حفظ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ قرآن کا ترجمہ پڑھنا اور تفاسیر کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن یہاں یہ پیش نظر رہے کہ دورانِ حفظ ہی قرآن کا ترجمہ پڑھنا اور تفاسیر کا مطالعہ کرنا شاید ممکن نہ ہو سکے تو اس کے لیے تکمیل حفظ کے بعد وقت نکال لینا چاہیے، البتہ یہ بات معیوب ہے کہ طالب علم صرف قرآن کے الفاظ کو ہی زبانی یاد کر لے اور ان کے مطالب و مفاہیم سے

[1] النحل 16: 78.

بے بہرہ رہے۔ اگر کوئی شخص حافظِ قرآن سے پوچھے کہ ﴿لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ﴾ میں إیلاف کا کیا معنی ہے؟ یا ﴿إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ﴾ میں کَنُود کا کیا مطلب ہے؟ تو حافظِ قرآن ان کے معانی سے لاعلم ہو تو یہ طالب علم کی شخصیت میں علمی نقص شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے قرآن حفظ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جن آیات کو یاد کرے اُن کا مفہوم بھی اُسے اَزبر ہو۔ اور ویسے بھی اگر وہ قرآن کا ترجمہ و تفسیر جانتا ہوگا تو پورے شعور اور ادراک کے ساتھ اس کی تلاوت کرے، پھر اس کی صرف زبان ہی قرآن کی تلاوت نہیں کرے گی بلکہ قلب و رُوح بھی اس کے ساتھ شریک ہوں گے اور یوں ایسی روحانی تبدیلی پیدا ہوگی کہ جو نہ صرف حافظِ قرآن کی زندگی بدل کر رکھ دے گی بلکہ روزِ آخرت بھی وہ قرآن کی کما حقہ نگہبانی کرنے کے صلے میں جنت کے اعلیٰ ترین درجات کا صحیح طور پر حقدار بن سکے گا۔

حفظِ قرآن کے ساتھ عمل بالقرآن کا اہتمام

اکثر حفّاظ فقط حفظ قرآن کو ہی اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہوئے، فلاح و نجات کے لیے کافی سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن کے الفاظ کو یاد کرنے سے کہیں زیادہ ضروری قرآن کے احکام پر عمل کرنا ہے اور درحقیقت یہی ذریعۂ نجات ہے، اس لیے جہاں حفظ قرآن کا اعزاز حاصل کیا جائے وہاں عمل بالقرآن کا اہتمام بھی فرض ہے۔ نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ اٰخَرِيْنَ»

''بلا شبہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے سے بہت سی قوموں کو رفعت و بلندی عطا فرماتا ہے اور بہت ساروں کو اسی کے باعث ذلیل و رسوا

کرتا ہے۔“[1]

یعنی اگر قرآن کے ساتھ تعلق کو مضبوط کیا جائے، اسے پڑھا جائے، یاد کیا جائے اور اس پر عمل پیرا ہوا جائے تو اللہ تعالیٰ رفعت و بلندی سے سرفراز کرتا ہے اور اگر اس کے احکام سے کنارہ کشی اختیار کی جائے تو اللہ تعالیٰ ذلت و رسوائی سے دوچار کر دیتا ہے۔

ابو عبدالرحمٰن السلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سیکھ لیتے تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتے جب تک ان آیات میں بیان کردہ احکامات پر عمل نہ کر لیتے، اسی لیے فرمایا کرتے تھے:

«تَعَلَّمْنَا الْقُرْآنَ وَالْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَمِيْعًا»

”ہم نے قرآن، علم شریعت اور قرآن و سنت کے احکامات پر عمل کرنا سب ایک ہی ساتھ سیکھا ہے۔“[2]

علم قرآن سے عرصۂ دراز تک منسلک رہنا

قرآن کریم کا علم حاصل کرنے کے سلسلے میں صحابہ کرام اور ائمہ مجتہدین ہمارے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ:

مَكَثَ بِضْعَ سِنِيْنَ فِيْ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ.

”آپ نے صرف سورۃ البقرہ سیکھنے میں کئی سال لگا دیے۔“[3]

---

[1] صحيح مسلم، كتاب المساجد و مواضع الصلاة باب فضل من يقوم بالقرآن، حديث: 1353. [2] تفسیر ابن کثیر: 2/1، مقدمة في اصول التفسير، ص: 5. [3] مقدمه في اصول التفسير لابن تيمية.

لفظ بضع تین سے نو تک کے ہندسوں پر بولا جاتا ہے، یعنی تین سے نو سال تک کا عرصہ آپ نے صرف ایک سورت کو یاد کرنے اور اس کی تفسیر سیکھنے میں صَرف فرمایا۔

ابو بکر بن عیاش رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں عاصم بن ابی النجود رحمہ اللہ کے پاس قرآن کریم کی تعلیم حاصل کیا کرتا تھا۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں ایک دن میں صرف ایک ہی آیت سبق سنایا کروں۔ قرآن مجید کے حفظ اور اس کے سمجھنے کے لیے یہ بہترین طریقہ ہے۔[1]

امام شافعی رحمہ اللہ نے اسے حصولِ علم کی شرائط میں شمار فرمایا ہے، آپ فرماتے ہیں:

أَخِيْ! لَنْ تَنَالَ الْعِلْمَ اِلَّا بِسِتَّةٍ: ذَكَاءٍ وَحِرْصٍ وَاجْتِهَادٍ وَبُلْغَةٍ وَ صُحْبَةِ أُسْتَاذٍ وَ طُوْلِ زَمَانٍ.

''حصولِ علم کے لیے چھ کام ضروری ہیں: ذہن کا استعمال، شوق و رغبت، محنت و کوشش، مناسب خوراک، استاذ کی صحبت اور عرصۂ دراز تک عملِ تعلیم سے وابستہ رہنا۔''

اسلاف کے ضبطِ قرآن کی چند مثالیں

- امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے مسلمہ بن مخلد رحمہ اللہ کے پیچھے نماز پڑھی تو انھوں نے سورۂ بقرہ کی قراءت کی اور ایک الف تک نہیں چھوڑا، یعنی مکمل سورت بغیر غلطی کے پڑھی۔[2]
- حفص بن غیاث ذکر کرتے ہیں کہ امام ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ نے حفظِ قرآن میں

[1] طبقات الحنابلة: 1/ 4. [2] سير أعلام النبلاء : 3/ 425.

ضبط وثبت پیدا کرنے کے لیے دس شیوخ سے قرآن پڑھا۔[1]

❁ امام اعمش رحمہ اللہ جب قرآن کی قراءت کرتے تو ایک حرف کی بھی غلطی نہ کرتے۔[2]

حفظِ قرآن کے اصول وضوابط

حفظ قرآن میں درج ذیل اصول وضوابط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

1. حفظ قرآن سے مقصود فقط رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی دنیوی مفاد یا نام ونمود کی خواہش نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ زوالِ برکت کے ساتھ ساتھ موجب سزا بھی ہے جبکہ خلوصِ نیت اتمامِ مقصد اور جزا و انعام کا موجب ہے۔

2. جس استاد سے اس مقدس کتاب کی تعلیم حاصل کی جائے، اس کا ادب و احترام خود پر فرض سمجھا جائے کیونکہ ادب سے ہی انسان بامراد ہوتا ہے جبکہ بے ادبی سے علم جیسی انمول دولت کے حصول سے قطعی محروم رہتا ہے۔

3. حفظ کرنے کے لیے اوّل تا آخر قرآن کریم کا ایک ہی نسخہ استعمال کرنا چاہیے، یعنی اگر سولہ سطری پر شروع کیا ہو تو آخر تک اسی پر حفظ کرے اور اگر پندرہ سطری ہو تو اسی پر پڑھتا رہے۔ اس طرح سے صفحات وسطور ذہن میں نقش ہو جاتے ہیں کہ کون سی سورت یا آیت کہاں سے شروع اور کہاں ختم ہو رہی ہے۔ لیکن اگر قرآن کریم کا نسخہ تبدیل کر لیا جائے تو عملِ حفظ میں خلل آ جاتا ہے اور اسباق کا ثبت شدہ نقش خلط ملط ہو جاتا ہے۔

[1] سیر أعلام النبلاء: 6/314. [2] سیر أعلام النبلاء: 6/235.

4. جو سبق آگے یاد کرنا ہو وہ پہلے استاذ کو ناظرہ سنا لینا ضروری ہے تاکہ اگر تلفظ میں کوئی غلطی ہو تو وہ حفظ ہونے سے پہلے ہی دور ہو جائے کیونکہ اگر نہ سنایا جائے اور وہ سبق ویسے ہی یاد کر لیا جائے تو اگر اس میں کوئی غلطی رہ گئی ہو گی تو وہ ذہن میں راسخ ہو جائے گی اور پھر اس کو دور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

5. پہلے پہل تھوڑا تھوڑا سبق یاد کرنا چاہیے تاکہ صحیح طور پر ذہن نشین ہو سکے۔ بعد میں حسب استطاعت بڑھاتے رہنا چاہیے۔

6. ہر سبق استاذ کو سنا لینے کے بعد کم از کم دس مرتبہ پھر دوہرایا جائے تاکہ وہ مکمل یاد ہو جائے اور بھولنے نہ پائے۔ نہ کہ استاذ کو سنا لینے کے بعد اسے بالکل چھوڑ دیا جائے۔

7. سبق کے بعد سب سے زیادہ سبقی کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ سبقی کا پارہ تازہ تازہ پڑھا ہوتا ہے اور زیادہ دوہرایا بھی نہیں گیا ہوتا، اس لیے اس کے بھول جانے کا زیادہ خدشہ ہوتا ہے۔

8. قرآن کو خوب یاد رکھنے کے لیے جس قدر ہو سکے زیادہ سے زیادہ منزل سنانی چاہیے تاکہ ایسا نہ ہو کہ قرآن تو حفظ ہونے کے قریب ہوتا چلا جائے لیکن پیچھے سے دوہرائی نہ ہونے کی وجہ سے منزل بالکل ہی یاد نہ ہو۔

9. جیسے جیسے سبق آگے بڑھتا جائے ویسے ویسے سبقی کے آخر سے سبق کی مقدار جتنے حصے کو منزل میں ملاتے جانا چاہیے اور سبقی کو محدود ہی رکھنا چاہیے تاکہ وہ صحیح طور پر یاد رہ سکے اور منزل سے زیادہ سبقی کا اہتمام ضروری ہے۔

10. کلاس کے اوقات کے علاوہ جو فارغ اوقات ہوں ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے اور محض تفریح و آرام میں ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کو مرتب کر کے سبق،

سبقی اور منزل یاد کرنے کے لیے وقت تقسیم کرنا چاہیے تاکہ پڑھائی کے لیے اضافی وقت دے کر حفظ میں مزید پختگی پیدا کی جائے۔

11 بعض قراء قریب الحفظ طالب علم کی سبقی و منزل سننا بند کر دیتے ہیں اور صرف اسے سبق پر ہی تمام تر توجہ مرکوز کر دینے کو کہتے ہیں۔ یہ طریقہ قطعاً غلط ہے کیونکہ بعد از حفظ وہ پارے جن کی دوہرائی نہیں کی ہوتی وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے حفظ کیے ہی نہ ہوں، اس لیے کہ وہ سب بالکل بھول چکے ہوتے ہیں، یوں ساری محنت اور وقت رائیگاں جاتا ہے۔

12 طالب علم آگے یاد کرنے کے لیے سبق کی مقدار خود متعین کرنے کے بجائے اپنے استاذ سے متعین کروائے تاکہ وہ اس کی استعداد و قوت کے پیش نظر جتنا مناسب سمجھیں اتنا یاد کرنے کو کہیں۔

13 ہر طالب علم کے لیے الگ الگ ڈائری ہونی چاہیے جس میں استاذ یومیہ رپورٹ تاریخ اور دن کے حساب سے تحریر کرے۔ اس کے سبق، سبقی اور منزل کے متعلق تفصیلاً لکھا جائے کہ کہاں سے کہاں تک سنایا؟ کتنی غلطیاں تھیں؟ کیفیت کیا رہی؟ اور مزید کس حد تک محنت کی ضرورت ہے؟ پھر اس ڈائری کا ہفتے یا مہینے بعد جائزہ لیا جائے اور بہتر کارکردگی پر حوصلہ افزائی اور کمی و کوتاہی پر سرزنش کی جائے۔

سب سے زیادہ اہم ضابطۂ تعلیم یہ ہے کہ طالب علم اللہ تعالیٰ کے حضور ہاتھ پھیلائے، کثرت سے دعا گو رہے کہ اللہ تعالیٰ اسے واجبات کو ادا کرنے والا اور منکرات سے بچنے والا بنائے رکھے، حصولِ علم میں راہنمائی فرمائے اور اسباق کے حفظ وضبط میں اعانت فرمائے۔

ضبطِ قرآن کے لیے معاون امور

قرآن کو یاد رکھنا، اسے حفظ کرنے سے زیادہ محنت چاہتا ہے، جس کے لیے درج ذیل امور معاون کی حیثیت رکھتے ہیں:

1. تمام نمازوں کو باجماعت ادا کرنا چاہیے، بلا عذر بغیر جماعت کے نماز قبول نہیں ہوتی اور ہر نماز میں مختلف مقامات سے قرآن کی تلاوت کرنی چاہیے، اس سے قرآن کو یاد رکھنے میں آسانی اور پختگی پیدا ہوتی ہے۔

2. نمازوں کے علاوہ بھی چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اور دن رات قرآن کی تلاوت کرتے رہنا چاہیے جیسا کہ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا قَامَ صَاحِبُ الْقُرْاٰنِ فَقَرَأَهٗ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ذَكَرَهٗ وَإِذَا لَمْ يَقُمْ بِهٖ نَسِيَهٗ»

''جب صاحبِ قرآن دن رات قرآن کی تلاوت کرتا رہتا ہے تو وہ اسے یاد رہتا ہے اور اگر وہ اس کا اہتمام نہیں کرے گا تو وہ بھول جائے گا۔''[1]

3. نوافل و تہجد کا اہتمام کر کے طویل قیام کرنا اور اُس میں زیادہ سے زیادہ قراءت کرنی چاہیے اسی طرح رمضان المبارک میں صلوٰۃ التراویح میں قرآن سنانا چاہیے۔ قرآن میں پختگی پیدا کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔

4. قرآن کو ترجمہ وتفسیر کے ساتھ پڑھنا چاہیے، اس سے ایک تو روایتاً و درایتاً دونوں طرح سے قرآن پر عبور حاصل ہو جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ احکام و مسائل میں

---

[1] صحيح مسلم بشرح النووی: 76/6، السلسلة الصحيحة: 96/2، حديث: 597.

بار ہا قرآنی دلائل دینے سے منزل پختہ ہو جاتی ہے۔

5 ان تمام امور سے بڑھ کر اہم معاملہ یہ ہے کہ گناہوں اور حرام کاموں سے احتراز کرنا چاہیے، کیونکہ بقول امام شافعی رحمہ اللہ علم نور ہے اور اللہ تعالیٰ کسی گنہگار کو یہ نور عطا نہیں فرماتا۔

اسی طرح امام ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مَا تَعَلَّمَ أَحَدٌ الْقُرْآنَ فَنَسِيَهُ إِلَّا بِذَنْبٍ.

''کوئی شخص قرآن کا علم حاصل کرنے کے بعد اسے بھلا دیتا ہے تو اس کا سبب صرف اس کے گناہ ہوتے ہیں۔''[1]



[1] مختصر قیام اللیل، ص: 162.

طالب علم اور نا معلوم مسائل

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴾

”تو ایسی چیز کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہ ہو۔ یقیناً کان، آنکھ اور دل ہر ایک کے متعلق (روزِ قیامت) سوال کیا جائے گا۔“[1]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو بھی نصیحت فرمائی، جب انھوں نے اپنے کافر بیٹے کی نجات کے لیے فریاد کی تھی:

﴿ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴾

”تو مجھ سے اس بات کا سوال مت کر جس سے تو لاعلم ہے۔ بے شک میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو (ایسا کرنے پر) جاہلوں میں سے ہو جائے گا۔“[2]

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نصیحت فرمائی کہ کسی سنی سنائی یا غیر تحقیق شدہ

---

[1] الاسراء 36:17. [2] هود 46:11.

بات کو آگے بیان نہیں کرنا چاہیے کیونکہ روزِ قیامت جسم کے دیگر اعضاء کی طرح کانوں، آنکھوں اور دل سے بھی سوال کیا جائے گا کہ انھوں نے کیا کچھ سنا، دیکھا اور سوچا، لہٰذا ہر بات کہنے اور سننے سے قبل اس کی تحقیق و تصدیق کر لینا ضروری ہے۔اور یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اگر آدمی معاشرے کی اصلاح کے لیے کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا تو پھر تحقیقِ احوال کے نام پر محض ٹوہ لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو اپنا حکم یاد کراتے ہوئے فرمایا کہ تیرا بیٹا کافر ہونے کے باعث تیرے اہل میں شمار نہیں ہوتا۔ تیرے اہل کے لوگ وہی ہیں جو تجھ پر ایمان لائے، لہٰذا تو اپنے بیٹے کی سفارش مت کر اور جن باتوں کا تجھے اللہ تعالیٰ نے خود ہی علم نہیں دیا، ان کے متعلق سوال بھی مت کر، مبادا ایسا کرنے سے تیرا شمار بھی جاہلوں میں کر دیا جائے۔

اس امر کی اہمیت کا اندازہ انھی دو دلائل سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی محبوب اور مقرب ترین ہستیوں کو بھی کوئی ایسی بات کرنے کا حکم نہیں ہے جس سے وہ لاعلم ہوں تو پھر ہم پر تو ان سے بدرجہا بڑھ کر یہ حکم لاگو ہوتا ہے۔

اہل کتاب کو سرزنش

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ هَاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾

”دیکھو! تم وہ لوگ ہو کہ تم نے اس بات میں جھگڑا کیا جس کا تمھیں علم تھا تو پھر اس بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمھیں علم نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ جانتا ہے جبکہ تم نہیں جانتے۔‘‘ [1]

یہاں اللہ تعالیٰ اہل کتاب کی یہ بری خصلت ذکر فرما رہا ہے کہ وہ ایسی باتوں میں اختلاف کیا کرتے تھے جس کا انھیں خود بھی علم نہیں ہوتا تھا، اس لیے ایسے امور و مسائل پر بحث کرنے سے گریز کرنا چاہیے جس کے متعلق انسان کو علم نہ ہو۔

کسی بات کا علم نہ ہو تو......؟

جس بات یا مسئلے کا علم نہ ہو اس کے متعلق بحث نہیں کرنی چاہیے بلکہ لاعلمی کا اظہار کر دینا چاہیے۔ امام ابن جماعہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ بھی علم ہی کا جز ہے کہ عالم کو جس مسئلے کا علم نہ ہو اس کے جواب میں لَا اَعْلَمُ (مجھے علم نہیں) کہہ دے، بلکہ بعض علماء نے تو لَا اَعْلَمُ کو نصف علم کہا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب کوئی عالم کسی مسئلے کا علم نہ رکھتا ہو تو اسے لَا أَدْرِيْ (میں نہیں جانتا) کہہ دینا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی عالم اس وجہ سے لاعلمی کا اظہار نہ کرے کہ لوگ کیا سمجھیں گے کہ اسے کچھ آتا ہی نہیں تو وہ سب سے بڑا جاہل ہے اور اس کی جہالت کی یہی دلیل ہے کہ وہ اس مسئلے کے متعلق علم نہ ہونے کے باوجود اس پر بحث کرنے اور فتویٰ دینے لگتا ہے۔

علماء کرام کے لیے سبق

علماء کرام کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں بہترین سبق ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ اپنی قوم کو وعظ فرما رہے تھے تو ایک شخص نے سوال کیا کہ روئے زمین پر آپ سے بڑھ کر بھی کوئی عالم ہے؟ چونکہ موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے

[1] آل عمران 3:66.

بلا واسطہ کلام ہوتا تھا، اس لیے انھوں نے فرما دیا کہ نہیں! مجھ سے بڑھ کر کوئی صاحبِ علم نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ کرتے ہوئے بتلایا کہ تمھیں اس کا علم میری طرف منسوب کرنا چاہیے تھا کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن تو نے ایسا نہیں کیا، اس لیے تُو فلاں مقام پر جا کر دیکھ کہ وہاں میرا ایک بندہ ایسے علم کا حامل ہے جس سے تُو بھی لاعلم ہے، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے اور پھر خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔[1]

اس قصے میں علماء کے لیے یہ سبق ہے کہ جس مسئلے کا انھیں علم نہ ہو اُس کے جواب میں لَا اَعْلَمُ یا لَا اَدْرِیْ کہہ کر اس کے علم کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا کریں۔[2]

لاعلمی کا اظہار کرنے کے فوائد

شیخ سعدی رحمہ اللہ لاعلمی کا اظہار کرنے کے یہ فوائد ذکر فرماتے ہیں:

1. عالم جھوٹ بولنے اور غلط راہنمائی کرنے سے محفوظ رہتا ہے۔
2. یہ علم میں پختگی کی دلیل ہے۔
3. جس مسئلے میں لاعلمی کا اظہار کرے اس کے متعلق مطالعہ و تحقیق کر کے اس مسئلے کا علم حاصل کر لیتا ہے۔
4. لَا اَعْلَمُ یا وَاللّٰہُ اَعْلَمُ کہنے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔
5. طلبہ کے لیے عمدہ سبق ہے کہ اگر انھیں بھی کسی مسئلے کا علم نہ ہو تو وہ بھی بلا دلیل و تحقیق جواب دینے کے بجائے لاعلمی کا اظہار کر دیں۔[3]

[1] صحیح البخاري: 74. [2] تذکرۃ السامع، ص: 42. [3] فتاویٰ سعدیہ، ص: 229,228.

بلا تحقیق فتویٰ...... اَسلاف کی نظر میں

- سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب کوئی عالم لَاأَدْرِیْ (میں نہیں جانتا) کہنا چھوڑ دیتا ہے تو وہ اپنے لیے جہالت کا سامان پیدا کرتا ہے۔
- امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی جب کسی مسئلے کے متعلق سوال کیا جاتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک جواب نہ دیتے جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی نازل نہ ہو جاتی۔
- امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لَاأَدْرِیْ کہنا نصف علم ہے۔
- امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ عالم ہر مسئلے کا جواب دے بلکہ جس مسئلے کا علم نہ ہو تو اس کا جواب کیسے دیا جا سکتا ہے!! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی جب کسی ایسے مسئلے کے متعلق سوال کیا جاتا جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم نہ ہوتا تو آپ واضح فرما دیتے کہ میں جبریل علیہ السلام سے سوال کروں گا۔
- امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عالم کی آزمائش میں کامیابی کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ اسے کم سے کم کلام کرنا پسند ہو۔
- امام ابو عبداللہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یقیناً وہ عالم دیوانہ ہے جو ہر مسئلے کے متعلق فتویٰ دیتا پھرے۔
- سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی مسئلے کے متعلق لاعلمی کا اظہار کرنے میں عار محسوس نہ کرنا میرے نزدیک یمن کے سفر کے برابر ہے۔
- امام ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی ایسے مسئلے کے متعلق فتویٰ دینے سے، جس کا علم نہ ہو، بحالتِ جہالت مر جانا بہتر ہے۔[1]

---

[1] الآداب الشرعیہ: 2/64-69.

علم وتحقیق سے فتویٰ دینا چاہیے

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عالم کو صرف انھی مسائل کے متعلق فتویٰ دینا چاہیے جن کے بارے میں اسے علم یقین حاصل ہو اور قرآن وسنت سے دلائل پر دسترس حاصل ہو۔[1]

امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جس مسئلے کے متعلق عالم کو بہ خوبی علم ہو اس کے بارے میں لوگوں کی راہنمائی کرنا فرض ہے اور جس مسئلے کا علم نہ ہو اس کے متعلق اپنے سے زیادہ صاحب علم سے راہنمائی لینا فرض ہے۔[2]

سائل کو دیگر علماء کی طرف رجوع کی ہدایت

اگر کسی مسئلے کے متعلق علم نہ ہو تو لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے سائل کو دیگر کبار علماء کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کر دینی چاہیے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک اعرابی نے پھوپھی کی وراثت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب میں فرمایا: لَاأَدْرِیْ۔ اس اعرابی نے حیرت سے پوچھا کہ کیا آپ نہیں جانتے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! میں نہیں جانتا، تم کسی اور عالم سے پوچھ لو۔

اسلاف کا اظہارِ لاعلمی

امام شافعی رحمہ اللہ سے متعہ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا اس میں طلاق ہے یا نفقہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا: وَاللّٰهِ لَا أَدْرِیْ.[3]

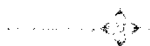
[1] الترتیب الإداریہ:1/404. [2] الحاوی للفتاوی:1/284. [3] تذکرۃ السامع، ص:42.

ایک شخص نے امام عمرو بن دینار رحمہ اللہ سے سوال کیا تو آپ نے لاعلمی کا اظہار فرمایا تو وہ شخص کہنے لگا کہ ابھی تو میں بہت سے مسائل آپ سے پوچھنے والا تھا لیکن آپ نے پہلے ہی سوال پر لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ آپ نے جواب دیا کہ تیرے سوالوں کا میرے پاس جو کے دانے کے برابر بھی جواب نہیں ہے۔

امام ابو اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ میں نے وُلدِ اسماعیلؑ سے ایک غلام آزاد کرنے کی نذر مانی تھی تو کیا میں اس کا مکلّف ہوں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔[1]

امام ابو الحصین رحمہ اللہ سے جب کسی ایسے مسئلے کے متعلق سوال کیا جاتا جس کا انھیں علم نہ ہوتا تو فرماتے: وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.[2]

قاسم بن محمد رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں کہ ہم سیدنا ابن عمر، ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کی مجالس علم میں شریک ہوا کرتے تو آپ حضرات ان مسائل پر گفتگو کرنے سے اجتناب کرتے جن کا علم نہ ہوتا۔[3]



[1] سیر أعلام النبلاء: 286/3. [2] تهذيب التهذيب: 127/7. [3] سیر أعلام النبلاء: 55/5.

علم کی نشر و اشاعت

علم کی نشر و اشاعت کا حکم

صرف علم حاصل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کر لینا چاہیے بلکہ علم کی دولت کو دوسرے تک منتقل کرنا بھی ضروری ہے بلکہ نبی مکرم ﷺ نے اس کا حکم فرمایا ہے کہ:

«بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً»

"مجھ سے جو بات بھی سنو اُسے دوسروں تک پہنچاؤ، اگرچہ وہ ایک آیت ہی ہو۔"[1]

یعنی ایک آیت کا بھی اگر کسی کے پاس علم ہو تو اس کو بھی دوسروں تک پہنچانا واجب ہے۔

بہترین شخص

علم کو دوسروں تک منتقل کرنا، صاحبِ علم پر فرض ہے اور ایسے شخص کو نبی ﷺ نے تمام لوگوں سے بہترین شخص قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ»

---

[1] صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب من ذكر عن بني اسرائيل، حديث: 3202.

''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔''[1]

اس فرمان میں صرف حصول علم پر ہی اکتفا کرنے والے کو خیر سے منسلک نہیں کیا گیا بلکہ اپنے علم سے دوسروں کو بھی بہرہ مند کرنے کی شرط لگائی ہے اور ان دونوں پر عمل پیرا ہونے سے ہی خیر و بھلائی کا محور ٹھہرا جا سکتا ہے۔

معلّم و مدرّس کی فضیلت

نورِ علم سے منور ہونے کے بعد دیگر لوگوں کو علم سے فیض یاب کرنے کی مثال نبی کریم ﷺ نے یوں بیان فرمائی ہے:

''جس علم و ہدایت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اس کی مثال اس بارش کی سی ہے جو موسلا دھار برستی ہے۔ جو زمین زرخیز ہوتی ہے وہ اسے جذب کر کے سبزہ و اناج اُگاتی ہے اور جو زمین بنجر ہوتی ہے وہ پانی جذب نہیں کرتی بلکہ روک لیتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ اسے بھی لوگوں کے لیے فائدہ مند بنا دیتا ہے۔ وہ اس سے (خود) پیتے اور (جانوروں کو) پلاتے ہیں اور زراعت کی زمین کو سیراب کرتے ہیں لیکن زمین کی ایک قسم ایسی ہوتی ہے جو بالکل چٹیل ہوتی ہے نہ خود پانی جذب کر کے کھیتی اُگاتی ہے اور نہ ہی روک کر لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔''[2]

اس مثال میں نبی کریم ﷺ نے زرخیز زمین کو اس معلم و مدرس سے تشبیہ دی ہے جو خود بھی علم کی دولت سے مستفید ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی اس سے مالا مال کرتا ہے۔

(1) صحيح البخاري، كتاب فضائل القرآن، باب خيركم من تعلم القرآن، حديث: 4639.

(2) صحيح البخاري، كتاب العلم، باب فضل من علم وعلّم، حديث: 79.

اشاعتِ علم کی مختلف صورتیں

علم کو دوسروں تک پہنچانے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، جن میں سے مندرجہ ذیل معروف اور رائج ہیں:

1 تعلیم وتدریس کے ذریعے

مدارس وجامعات میں یا انفرادی اہتمام سے حلقاتِ دروس اور مجالس علم منعقد کرنا اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات کی اہمیت وضرورت کا احساس دلا کر شرکت کی ترغیب دلانا اور انھیں علم دین سے مستفید کرنا۔ یہ طریقہ سب سے زیادہ مقبول اور مؤثر ہے۔

2 تصنیف وتالیف کے ذریعے

کسی موضوع پر اس سے متعلقہ مباحث، نصوص و دلائل اور اقوال و آثار جمع کر کے ایک رسالے یا کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے جس سے طالبان علم اور عام افراد استفادہ کر سکیں۔

3 صوتی آلات کے ذریعے

آڈیو کیسٹ یا سی ڈی وغیرہ میں کسی ایک موضوع پر مدلل گفتگو یا تقریر ریکارڈ کر دی جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ گھر یا دفتر میں یا جیسے ممکن ہو اس سے اپنی علمی تشنگی دور کی جا سکتی ہے۔

4 خطابات وتقاریر کے ذریعے

اس سے طلبہ کے علاوہ عوام بھی قرآن و سنت میں بیان کردہ شرعی احکام و

مسائل اور علمی نکات وفوائد کو احاطۂ علم میں لا سکتے ہیں۔

5 علمی مباحث ومناظروں کے ذریعے

اس سے اختلافی مسائل میں طرفین کے دلائل معلوم ہوتے ہیں اور مسنون و مستند احکام سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

بعض اوقات سامع زیادہ یاد رکھتا ہے

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مسئلے کا علم حاصل کر کے آگے پہنچانے والے سے زیادہ سننے والا بہتر طور پر اسے سمجھتا اور یاد رکھتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ علم کی چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی دوسروں تک پہنچایا جائے تاکہ اگر کبھی آپ کو وہ بھول بھی جائے تو جسے آپ نے بتلائی ہو اُسے یاد رہے اور آپ یا دیگر لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ نبی مکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کا خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد حاضرین کو یہ حکم فرمایا کہ:

«لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسٰى أَنْ يُّبَلِّغَ مَنْ هُوَ أَوْعٰى لَهٗ مِنْهُ»

''جو یہاں حاضر ہے وہ (یہ تمام احکام) اُس تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں ہے۔ بعض اوقات جسے بات بتلائی جائے وہ حاضر شخص (یعنی براہِ راست سننے والے) سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔''[1]

[1] صحيح البخاري، كتاب العلم، باب قول النبي ﷺ: رب مبلغ أوعى من سامع، حديث: 67.

تحقیق وتصدیق سے تعلیم دینی چاہیے

مستند اور ٹھوس مسائل کی تعلیم دینی چاہیے۔ کسی کام کو کرنے یا اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کام کو اختیار کرنے کے لیے دلیل پتہ ہونی چاہیے۔ غیر مستند اور غیر مصدقہ مسائل اور سنی سنائی باتوں کی ہرگز نشر واشاعت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ نبی مکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ»

''کسی بھی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو آگے بیان کر دے۔''[1]

خیر و بھلائی کی تعلیم دینی چاہیے

کسی کو دین اسلام کے فرائض کا علم سکھلانا صدقہ جاریہ ہے۔ اس طرح سے علم بڑھتا ہے۔ لیکن یہ پیش نظر رہے کہ کسی کو روح اسلام کے خلاف کسی بھی کام کی تعلیم نہ دی جائے کیونکہ دین کا علم ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے فرد حتی کہ قیامت تک تمام اہل ایمان کے سینوں میں محفوظ ہونا ہے۔ امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ حدیث مبارکہ ذکر فرمائی ہے:

إِنَّ مِنَ النَّاسِ مَفَاتِيْحُ لِلْخَيْرِ مَغَالِيْقٌ لِلشَّرِّ وَإِنَّ مِنَ النَّاسِ نَاساً مَفَاتِيْحُ لِلشَّرِّ مَغَالِيْقٌ لِلْخَيْرِ فَطُوْبٰى لِمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ مَفَاتِيْحَ الْخَيْرِ عَلٰى يَدَيْهِ وَوَيْلٌ لِمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ

---

[1] صحيح مسلم، المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ماسمع، حديث: 6.

مَفَاتِيْحَ الشَّرِّ عَلٰى يَدَيْهِ.

''کچھ لوگ خیر و بھلائی کی اشاعت کا ذریعہ اور شر و برائی کے سد باب کا باعث بنتے ہیں اور اسی طرح کچھ لوگ شر و برائی کو پھیلانے کا ذریعہ اور خیر و بھلائی کے راستے بند کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں، لہٰذا اس شخص کے لیے (جنت کی) خوشخبری ہے جس کو اللہ تعالیٰ بھلائی کی اشاعت کا ذریعہ بنا دیں اور اس شخص کے لیے ہلاکت ہے جس کے ذریعے سے برائی پھیلتی ہے۔''[1]



[1] سنن ابن ماجه، كتاب الإيمان، باب من كان مفتاحًا للخير، حديث:233.

طالبِ علم اور علمی مباحث و مناظرے

علمی و تحقیقی مجالس کا قیام

علمی موضوع پر منعقد ہونے والی مجالس، طالبِ علم کے لیے نہایت مفید اور عملِ تعلیم میں مؤثر کردار ادا کرتی ہیں۔ ان مجالس میں طرفین کے مؤقف اور ان کے دلائل کا تقابل و تجزیہ کرتے ہوئے راجح و مرجوح کی نشان دہی ہوتی ہے۔ بسا اوقات معاملہ مناظرے کی صورت اختیار کر جاتا ہے، جس میں ہر فریق ہر لحاظ سے مخالف فریق کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی صورت حال میں انتہائی سلجھے ہوئے انداز میں اپنا مؤقف پیش کرنا اور اسی طرح برداشت و اطمینان سے کام لیتے ہوئے مخالف کی بات سننا چاہیے۔ علمی مباحثوں اور مناظروں کو علمی و اخلاقی ماحول میں ہی نمٹانا چاہیے جیسا کہ اسلاف کرام رحمہم اللہ کا شعار تھا۔

علمی مباحث و مناظرے کے آداب

علمی مباحثے و مناظرے کے دوران چند آداب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

مقصد فقط رضائے الٰہی ہو

علمی مباحثے و مناظرے کے ذریعے اپنی علمی برتری اور اپنے مسلک کی ترویج

واشاعت مقصود نہ ہو بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنا مطلوب ہو۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اسلاف کسی علمی مسئلے پر بحث کرتے تو صرف اس نیت سے کہ رضائے الٰہی کا حصول اور حق بات کا اظہار ہو۔ اگر کسی فریق پر کوئی مسئلہ مخفی ہوتا تو دوسرا اُس کی راہنمائی کرتا کیونکہ ان کا مقصد علمی فوقیت و برتری جتلانا نہیں ہوتا تھا۔[1]

2 مخالف کے قوی دلائل کو قبول کیا جائے

مباحث ومناظرے میں اگر فریقِ مخالف کے دلائل قوی ہوں تو انھیں قبول کرنا چاہیے اور تعصب وہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا انکار نہیں کرنا چاہیے لیکن اگر آپ کے پاس ان کے دلائل کا قوی جواب موجود ہو تو مخالف فریق کے سامنے پیش کرنے چاہئیں تاکہ وہ بھی آپ کے دلائل کو پرکھ سکے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ مناظرے کے آداب میں فرماتے ہیں کہ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ مخالف کے کلام کو بغور سنے، اس کے صحیح دلائل کو قبول کرے اور ناقص رائے کو رد کرے اور اگر کسی کے پاس دلائل نہ ہوں اور وہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی مخالف کے دلائل کو فرضی اصول اور زبان درازی سے رد کر دے تو گویا اس نے جھوٹ بولا اور حق کو ٹھکرایا ہے۔[2]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

علمی مباحث ومناظرے میں فریقین کے مؤقف مختلف ہونے کی بنا پر ایک فریق دوسرے فریق کے دلائل کو ہر طرح سے رد کرنے کی کوشش کرتا ہے، لہٰذا

---

[1] تلبیس ابلیس، ص: 120۔ [2] مقدمة التفسير: 10/1۔

جس فریق کے دلائل قوی ہوں تو فریق ثانی کو انھیں قبول کرنا چاہیے اور اگر کوئی شخص کتاب وسنت کے دلائل اور ائمہ امت کے اجماع کو رد کرے تو اس سے کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کے ساتھ اہلِ بدعت کا سا معاملہ برتا جائے گا۔[1]

اصل موضوع کو ملحوظ رکھا جائے

مباحثے و مناظرے میں جو موضوع مقرر کیا گیا ہو، ساری گفتگو اسی میں محدود رہنی چاہیے نہ کہ فروعات و جزئیات میں سارا وقت صَرف کر دیا جائے۔ اگر کوئی فریق اس سے ہٹ کر دوسرے موضوع کی طرف نکل پڑے تو اسے تنبیہ کر دینی چاہیے تاکہ ایسی فروع میں اختلاف طول نہ پکڑے۔لیکن اگر کوئی ایسی بات زیر بحث آتی ہے جو مقررہ موضوع کا لازمی جز ہو، یا اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے اس پر گفتگو کرنا ضروری ہو جیسے ردّ قادیانیت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے اور قربِ قیامت نزول پر بحث کرنا ضروری ہے تو یہ مناظرے کا اصل موضوع ہی شمار ہوں گے۔

خلوص و محبت کی فضا قائم رہے

مناظرے کے اول تا آخر آپس میں ایک دوسرے کے لیے خلوص و محبت کی فضا قائم رکھنی چاہیے۔ بسا اوقات کسی فریق کی طرف سے غیر موزوں رویے کی وجہ سے دونوں میں غصے کی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے جو سراسر شیطانی حملہ ہوتا ہے اور کسی عالم دین کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ جاہلوں جیسی عادات کو اپنائے اور

1. مجموع الفتاویٰ: 172/24.

لڑائی جھگڑے پر اُتر آئے بلکہ اگر ایک فریق کی طرف سے شعوری یا لاشعوری طور پر کسی نادانی کا اظہار ہوتا ہے تو فریقِ ثانی وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرے اور اس کی نادانی کو نظر انداز کر دے تاکہ ماحول خوشگوار رہے اور یہ بحث کسی نتیجے پر پہنچ کر شرعی راہنمائی مہیا کر سکے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابن قدامہ رحمہ اللہ جب کسی سے مناظرہ کرتے تو مسکراتے ہوئے بات کرتے تھے۔ لوگ ان کی بابت کہا کرتے تھے کہ یہ تو اپنے مخالف کے جواب میں اسے مسکرا کر ہی قتل کر دیتے ہیں۔[1]

ضبطِ نفس ہو، اشتعال انگیزی نہ ہو

مباحثے میں خوش خُلقی، نرم مزاجی اور احترام و اکرام کو پیش نظر رکھا جائے۔ اگر ایک طرف سے دانستہ یا نادانستہ طور پر ناشائستہ بات ہو جاتی ہے تو فریقِ ثانی کو ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے اور اشتعال انگیزی نہیں بلکہ فراخ دلی سے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ اگر ہو سکے تو اسے اچھے کلمات کے ساتھ جواب دے تاکہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ اپنی اس حرکت پر نادم ہو اور آئندہ اس سے احتراز کرے۔

ابن عون رحمہ اللہ کے بارے میں مذکور ہے کہ جب انھیں کوئی غصہ دلاتا تو وہ اسے بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ (اللہ تعالیٰ آپ کو برکت سے نوازے) کہہ کر دعا دیتے۔[2]

حق بات کو قبول کرے

فریقین میں سے ہر ایک میں قبولِ حق کا وصف ہونا چاہیے، چنانچہ جب مباحثے و مناظرے میں ایک فریق اپنے پختہ دلائل کی وجہ سے کامیاب قرار پاتا

---

[1] ذيل طبقات الحنابلة: 137/2. [2] سير أعلام النبلاء: 366/6.

ہے تو فریقِ ثانی پر ضروری ہے کہ وہ اپنے مؤقف سے رجوع کرے اور حق بات کو قبول کرے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو مکتوب بھیجا جس میں یہ تحریر تھا کہ کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت اپنی رائے دیتے ہوئے کتاب وسنت کے فیصلے کو ملحوظ رکھنا اور اگر کہیں آپ کی رائے اس سے مختلف ہو تو اسی کو ترجیح دینا کیونکہ حق بات ہی مقدّم ہے، کسی اور چیز کو اس پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔[1]

اسی ضمن میں امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے بچپن میں نماز کے بعد اذکار کے متعلق ایک حدیث سنی اور تقریباً تیس برس تک اس پر عمل کرتا رہا اور میرے خیال میں وہ روایت حسن درجے کی تھی لیکن جب میرے علم میں آیا کہ وہ موضوع (من گھڑت) ہے تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔[2]

7 جیت کا اعلان و تشہیر نہ کی جائے

جب کسی مباحثے و مناظرے میں ایک فریق غالب آتا ہے تو اسے عاجزی و انکساری کا اظہار کرتے ہوئے اسے مسئلہ حق کی وضاحت کرنے میں اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق سمجھے نہ کہ وہ اسے اپنا علمی کارنامہ سمجھ کر اپنے علم و مسلک کی جیت ثابت کرتے ہوئے اس کی تشہیر کرتا پھرے۔ بعض مناظر تو اسے باقاعدہ اپنے لیے سند کی حیثیت دیتے ہیں اور دوبارہ جہاں کہیں بھی مباحثہ ہو تو سب سے پہلے وہ اپنے جیتے ہوئے مناظرے کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں جو کہ سراسر جہالت اور ریاکاری پر مبنی عمل ہے۔

---

[1] إعلام المؤقعين، ص: 85. [2] الموضوعات لابن الجوزي: 245/1.

اپنے مؤقف کو حق ثابت کرنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اس مباحثے ومناظرے کو اس طرح پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہیے کہ آپس میں ادب و احترام اور خلوص ومحبت کی فضا قائم رہے۔ آپ کی جیت کے باوجود فریق مخالف آپ سے متأثر رہے۔ آپ اس کے ساتھ ایسا انداز اپنائیں کہ وہ آپ کے مؤقف کو قبول کرنے کی خواہش کرے اور دیگر لوگ بھی درست موقف کے مطابق اپنے عقائد واعمال کی اصلاح کر سکیں نہ کہ اعلان وتشہیر کا انداز اپنا کر عصبیت و نفرت کو فروغ دیا جائے اور لوگوں کو دین سے دور کیا جائے۔

8 ماحول ناساز ہونے پر مناظرہ ختم کر دیا جائے

مناظرے کے دوران اگر تلخی پیدا ہو جائے اور عناد وزیادتی کا اظہار ہونے لگے تو اسے فساد وافتراق سے بچانے کے لیے وہیں ختم کر دینا چاہیے اور جگہ و تاریخ تبدیل کر کے دوبارہ منعقد کیا جائے تاکہ مناظرے کی تکمیل خوشگوار ماحول میں ہو سکے۔



طالب علم کے لیے پند و نصائح

حصول علم کے لیے نوجوانوں کی دلچسپی کو دیکھ کر ہم معاشرے میں دینِ اسلام کی بدولت اصلاح اور تغیرّ کی بشارت دے سکتے ہیں۔لیکن حصولِ علم کے لیے جستجو سے پہلے ضروری ہے کہ اسلاف سے منقول اُن آداب و عادات کو اپنایا جائے جو اس عظیم کام کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔اس سلسلے میں ہم کچھ پند و نصائح طالب علم کے گوش گزار کرنا چاہیں گے جن پر عمل پیرا ہو کر وہ حاصل کردہ علم میں رسُوخ پیدا کرسکتا ہے اور اسے اپنی فلاح و کامرانی اور نجات کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

پہلی نصیحت: اخلاصِ نیت

طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم کے حصول کے لیے اخلاص کے ساتھ کوشش کرے، یعنی حصول علم سے مقصود لوگوں کی راہنمائی کرنا، انھیں اللہ تعالیٰ و رسول کے احکام بتلانا، اس پر خود بھی عمل کرنا اور دوسروں کو بھی باعمل بنانا، اس علم کی اشاعت و ترویج کی کسی لالچ کے بغیر کوشش کرنا اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہو۔

دوسری نصیحت: آداب و فضائلِ علم کی پہچان

حصولِ علم کی راہ میں قدم رکھنے سے پہلے طالب علم کو، علم کی حقیقت، ضرورت

اور اہمیت کے بارے میں آگاہی حاصل کر لینی چاہیے اور اس علم پر عمل پیرا ہونے اور اسے آگے پھیلانے کے فضائل وفوائد کو بھی جان لینا چاہیے تا کہ حصولِ علم کے لیے رغبت وشوق پیدا ہو جائے۔

تیسری نصیحت: خود نمائی اور علمیت بگھارنے سے پرہیز

انسان میں خود نمائی، خود پسندی اور اپنی ذات کی تعریف وتوصیف کا رجحان اور جذبہ شیطانی وسوسہ ہوتا ہے۔ اہلِ علم میں یہ جذبہ اور رجحان پیدا ہونا ان کے لیے ایک زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ریا کاری بھی ہے اور رعونت وتکبر بھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے غصے اور غضب کو دعوت دینے والا معاملہ ہے۔ اس سے خود کو محتاط رکھنا چاہیے، ورنہ روز قیامت تباہی اور خسارے کا باعث بن سکتا ہے۔

چوتھی نصیحت: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت ثناء بیان کرنا

جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو اُس وقت اللہ کی ثناء بھی بیان کی جائے، یعنی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جَلَّ شَانُہٗ، جَلَّ جَلَالُہٗ اور عَزَّ وَجَلَّ وغیرہ جیسے کلمات ادا کرنے چاہئیں اس سے اللہ کے عظیم نام کا حق ادا ہوگا، انسان کے دل میں اللہ کی عظمت و بڑائی پیدا ہوگی اور انسان اللہ کو ہر وقت اپنے قریب پائے گا اور اس کے رحم وکرم کا مستحق ٹھہرے گا۔

پانچویں نصیحت: نبی کریم ﷺ کے ذکر کے وقت درود وسلام پڑھنا

کتبِ حدیث اور اسانید میں تحقیق کرنے والوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے پاس دس دس بلکہ سوسو مرتبہ نبی کریم ﷺ کا ذکر ہوتا ہے اس کے باوجود وہ

اس کی کتابت میں کوتاہی نہیں کرتے لیکن عملی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ نبی کریم ﷺ کا نام بار بار لکھتے جائیں گے لیکن زبان سے ایک مرتبہ بھی درود و سلام ادا نہیں ہوگا، بلکہ بعض لوگ ﷺ کے بجائے حرف ص یا صلعم کو بطور درود کی رمز کے لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا چاہیے۔ صرف حرف ص یا صلعم لکھ کر قاری اور سامع کو درود پڑھنے سے اور اس کے اجر سے محروم کر دیتے ہیں۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب تدریب الراوی میں ذکر کیا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ مَنْ كَتَبَ صلعم قُطِعَتْ يَدُهُ لِأَنَّهُ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً.

"جس نے (ﷺ لکھنے کے بجائے) صلعم کا لفظ لکھنے آغاز کیا اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا کیونکہ اس نے ایک برا طریقہ ایجاد کیا ہے۔"

اخبار صحیحہ یا ضعیفہ میں بھی اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، چنانچہ طالب علم کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ ہمیشہ کم تر کے بجائے ارفع و اعلیٰ طریقے کو اپنائے اور اجر بڑھانے والے کاموں میں سستی نہ کرے، یعنی نبی ﷺ کے اسمِ گرامی کے ساتھ اس جیسی رموز لکھنے کی بجائے مکمل ﷺ لکھنا چاہیے۔

چھٹی نصیحت: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر کے وقت رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ کہنا

ہمیں ہر صحابی کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ ضرور کہنا چاہیے۔ اکثر طور پر پڑھنے اور سننے میں آیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ تین اوصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ:

قَالَ الْإِمَامُ عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ یا قَالَ عَلِيٌّ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ یا قَالَ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ.

ان کلمات میں شان و تعظیم کا بہت غلو پایا جاتا ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ اور دیگر اہل علم نے بیان کیا ہے کہ رضي الله عنه کو تمام صحابہ کو چھوڑ کر صرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں ہے کیونکہ سیدنا (ابوبکر و عمر) اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہم ان سے افضل ہیں۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کتب حدیث کے بہت سے نسخوں کی عبارتوں میں یہ بات غالب ہے کہ تمام صحابہ ایک طرف رکھ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علیہ السلام کہنے میں انفرادیت دی جاتی ہے یا ''كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ'' کہنے میں بھی انھی کو خاص کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ کلمہ بھی درست ہے لیکن تکریم و تعظیم کی رو سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان مساوات ہی مناسب ہے حالانکہ امیر المؤمنین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور امیر المؤمنین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ یہ تینوں اصحاب کرام امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔

''كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ'' کے الفاظ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خصوصیت دینے والوں کا خیال ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ قول ہی مردود ہے کیونکہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم تو پیدا ہی عہدِ اسلام میں ہوئے ہیں جیسا کہ چھوٹے صحابہ ہیں، بلکہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں بھی ثابت ہے کہ انھوں نے بھی کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ تو پھر ان سب کے ساتھ یہ کلمات کیوں نہیں بولے جاتے؟ لہٰذا اس معاملے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوسروں سے خصوصیت نہیں دینی چاہیے۔

امام ہیثمی رحمہ اللہ جیسے بعض علماء نے اپنی فتاویٰ میں اس کی اجازت دی ہے لیکن ان کی بات ناقابل اعتماد ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ہیثمی کی طرف سے ان الفاظ کے

ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تخصیص کو رد کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ ان سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: قال ابوبکر، قال عمر، وقال عثمان و قال الإمام علی اور شاید کہ یہ لفظ ان میں سے بعض کے نزدیک شیعہ کے لیے باعث نزاع ہے کیونکہ ان کے خیال میں امامت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور کا حق نہیں ہے۔ بہرحال تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسماء کے ساتھ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ ضرور کہنا اور لکھنا چاہیے، اور کسی ایک کو انفرادیت دینے کی غلط روش نہیں اپنانی چاہیے تاکہ صحابہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ کے مقام وفضیلت میں مساوات کا اہتمام ہو سکے۔

ساتویں نصیحت: ائمہ کرام کے ذکر کے وقت رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی کہنا

بعض طلبہ حدیث کو سند کے ساتھ پڑھتے ہیں اور وہ سند کے تمام رجال کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ایسے طلبہ یقیناً تعریف وستائش کے سزاوار ہیں۔ ان پر رب کا انعام ہے۔ اور رب تعالیٰ اپنی عطا کا خطیر حصہ دینے کے لیے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں خاص کر لیتے ہیں۔ ہر امام کے نام کے ساتھ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی پڑھنے سے مشقت تو ہوتی ہے لیکن اگر انسان اس کو اپنی عادت بنا لے تو پھر کوئی مشکل نہیں ہوگی۔

آٹھویں نصیحت: حدیث پڑھ کر مرجع کی طرف نسبت کرنا

خصوصاً کتب احادیث اور اس سے متعلقہ علوم پر مبنی کتب کو مرجع کہا جاتا ہے اور یہ وہ کتب ہیں جن میں سو یا ہزار یا اس سے زائد احادیث جمع کی گئی ہوتی ہیں، مثلاً: کنز العمال اور جامع الأصول اور چھوٹی کتب: ریاض الصالحین،

الترغیب والترھیب، بلوغ المرام وغیرہ

جب طالبِ علم ریاض الصالحین سے کوئی حدیث پڑھے اور صاحب کتاب نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد رواہ الشیخان یا رواہ البخاری و مسلم لکھا ہو تو طالب علم پر بھی لازم ہے کہ وہ نسبت کرنے میں احتیاط سے کام لے تاکہ اس پر کوئی مؤاخذہ نہ ہو، یعنی وہ کہے کہ اسے امام نووی نے اپنی کتاب ریاض الصالحین میں ذکر کیا ہے اور اس کی نسبت شیخین کی طرف کی ہے تاکہ اگر مصنف نے اس کی نسبت میں غلطی کی ہے تو طالب علم پر کوئی ملامت نہ ہو، چنانچہ اسے چاہیے کہ وہ اس احتیاط کو ملحوظ رکھے۔

نویں وصیت: صحیحین میں موجود حدیث کی نسبت صحیحین ہی کی طرف کی جائے

اگر کوئی حدیث شیخین کے علاوہ کسی اور نے بھی بیان کی ہو تو طالب علم کو چاہیے کہ وہ اس حدیث کی شیخین کی طرف ہی نسبت کرے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ دوسری کسی بھی حدیث کی کتاب سے پہلے شیخین کی طرف ہی اس حدیث کی نسبت کرے۔

شارح بخاری مغلطائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

لَيْسَ لِحَدِيْثِي عَزْوُ حَدِيْثٍ فِيْ اِحْدَى السِّتَّةِ لِغَيْرِهَا اِلَّا زِيَادَةً لَيْسَتْ فِيْهَا اَوْلِبَيَانِ سَنَدِهِ وَرِجَالِهِ۔

”کتب ستہ کے علاوہ کسی اور کتاب کی طرف میری حدیث کی نسبت کسی اضافے یا اس کی سند و رجال کے بیان کی وجہ سے ہوتی ہے۔“

دسویں نصیحت: بات آگے بیان کرنے سے پہلے تحقیق کرنا

اللہ تعالیٰ نے ادب سکھاتے ہوئے ہم سے فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ﴾

''اے ایمان والو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔''

لہٰذا جب کوئی شخص آپ سے کسی بھی طرح کی بات بیان کرے تو آپ پر اس کی تحقیق کرنا لازم ہے اور اسی طرح آپ جب کسی بات کو آگے نقل کریں تو تب بھی لازماً تحقیق کریں۔

گیارہویں نصیحت: علمی فائدہ پہنچانے والوں کی تعظیم کی جائے

جس سے علمی فائدہ حاصل ہو اُس کی تعریف و توصیف اور شکریہ ادا کیا جائے۔ جیسا کہ قولِ شاعر ہے:

إِذَا أَفَادَكَ إِنْسَانٌ بِفَائِدَةٍ مِّنَ الْعُلُوْمِ فَأَدْمِنْ شُكْرَهٗ أَبَدًا

وَقُلْ فُلَانٌ جَزَاهُ اللّٰهُ صَالِحَةً أَفَادَنِيْهَا وَأَلْقِ الْكِبْرَ وَالْحَسَدَا

''جب کوئی انسان تجھے کچھ علمی فائدہ دے تو اس کا ہمیشہ شکر گزار رہ اور دعا کر کہ فلاں کو اللہ جزائے خیر دے، اس نے مجھے علمی فائدہ دیا اور فخر و حسد کو دل سے نکال پھینک۔''

بارھویں نصیحت: علمی نکات کو نظر انداز نہ کریں

کسی علمی محفل و مذاکرے میں مقررین یا کلاس میں استاذ کے بیان کردہ نکات کو لکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ ایک مدت بعد آپ دیکھیں گے کہ آپ کی لکھی ہوئیں وہ معلومات ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر جائیں گی، جو تا حیات آپ کے لیے عظیم علمی سرمایہ بن جائے گا۔

تیرھویں نصیحت: خود غرضی سے اجتناب

دوران تعلیم اگر ہم سفر و ہم مکتب لوگ علمی راہ نمائی و مدد کے طلب گار ہوں تو اس سے پہلو تہی کرنا خود غرضی ہے۔ حالانکہ علم ایسی دولت ہے جو خرچ کرنے سے بڑھتی ہے، لہٰذا علمی کاموں میں ایک دوسرے کی مدد اور تعاون باہمی حق بھی ہے اور فرض بھی۔ لیکن شیطان انسان کا دشمن ہے، وہ وسوسہ ڈال سکتا ہے کہ یوں نہ کرو، اس طرح کرو گے تو فلاں تم سے آگے نکل جائے گا۔ یہ خود غرضی کی علامت ہے، اس سے بچنا چاہیے۔

میرے بھائی! تو اس خود غرضی کو اپنے دل سے نکال دے کیونکہ جس کے دل میں یہ برائی پیدا ہو جائے وہ اس کا گناہ مول لینے کے ساتھ ساتھ علم کو چھپانے کا جرم بھی کرتا ہے۔ اس سے نہ صرف علم کی برکت ختم کر دی جاتی ہے بلکہ یہ خصلتِ رزیلہ کتمانِ علم (یعنی علم کو چھپا رکھنے) کی سزا کا بھی موجب بنتی ہے۔ اگر آپ اپنے پاس موجود علمی باتوں کو دوسروں تک پہنچائیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں اضافہ فرما دے گا۔

چودھویں نصیحت: ضعیف اور موضوع روایات کو بیان نہ کیا جائے

اہل علم کی گفتگو کو معاشرے میں ایک دلیل اور سند کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، لہٰذا ہر مسئلہ میں مستند گفتگو کرنی چاہیے۔ خصوصاً احادیث نبوی کے معاملے میں تو نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، چنانچہ احادیث بیان کرتے وقت ان کی صحت کے متعلق جاننا لازمی امر ہے ورنہ اگر حدیث ضعیف اور موضوع ہوگی تو وہ نبی کریم ﷺ پر جھوٹ ہوگا، اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں جھوٹ بولنے والے کے بارے میں جہنم کی وعید آئی ہے۔

پندرھویں نصیحت: حدیث کو ضعیف قرار دینے سے احتراز

بعض لوگ جب کسی حدیث سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس کی سند میں کسی ایسے شخص کا نام دیکھتے ہیں کہ جسے ضعیف قرار دیا گیا ہوتا ہے تو وہ فوراً اس حدیث کے ضعیف ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں، حالانکہ احادیث تو کئی اسناد سے منقول ہوسکتی ہیں۔

چنانچہ آپ بغیر کسی ٹھوس دلیل کے حدیث کو ضعیف کہنے میں جلدی مت کریں، مثلاً: ایک حدیث کی دو سندیں ہیں: ایک سند سے وہ حدیث صحیح ہوتی ہے اور دوسری سند سے وہ حدیث ضعیف ہوتی ہے۔

امام احمد اور ابن ماجہ رحمہ اللہ کی روایت کردہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے کہ:

صَلَاةُ السَّفَرِ رَكْعَتَانِ، وَصَلَاةُ الْجُمُعَةِ رَكْعَتَانِ، وَالْفِطْرُ

وَالْأَضْحٰی رَكْعَتَانِ تَمَامٌ غَيْرَ قَصْرٍ عَلٰى لِسَانِ مُحَمَّدٍ ﷺ.[1]

اس حدیث کو جب آپ مسند احمد میں پڑھیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اس حدیث کو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں اور ابن ابی لیلیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے، چنانچہ حدیث منقطع ہوگئی اور یہ علت حدیث میں معیوب ہے۔ لیکن اگر آپ اسی روایت کو ابن ماجہ میں دیکھیں گے تو اس میں ابن ابی لیلیٰ نے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے تو پھر آپ اس حدیث کو اس بات کا اضافہ کرتے ہوئے درست مان لیں گے کہ یہ حدیث دوسرے طرق سے منقطع بھی مروی ہے، چنانچہ طالب علم کو اپنے کلام میں انتہائی باریک بین ہونا چاہیے اسے اور اس جیسی حدیث بیان کرنے کے بعد اس کی وضاحت کرنی چاہیے کہ یہی حدیث امام احمد رحمہ اللہ کے طریق سے ضعیف ہے تو ایسی صورت میں وہ قابلِ ملامت نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جائے کہ یہ حدیث ضعیف ہے تو یہ اس کے نقصِ علم کی دلیل ہوگی۔

سولھویں نصیحت: مسائل کی تحقیق کرنی چاہیے

اس سے آپ کو کتب کے متون کو کریدنے اور تحقیق کرنے میں مدد ملے گی۔ شیخ ابن سعدی رحمہ اللہ سے کسی شخص نے کوئی سوال کیا تو آپ نے اس مسئلے میں اضافہ کر دیا، پھر سائل نے معذرت کرتے ہوئے کہا: معاف کیجیے، ہم نے کچھ زیادہ ہی آپ سے پوچھ لیا۔ لیکن جب شیخ نے ان کے سوال کا جواب دیا تو ساتھ

[1] سنن ابن ماجه، كتاب إقامة الصلاة باب تقصير الصلاة في السفر، حديث: 1064، مسند أحمد: 257.

یہ بھی کہا کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے سوالات کر کے ہمیں تحقیق اور کتب بینی کا موقع فراہم کیا۔

چنانچہ آپ سے جب کوئی شخص سوال کرے اور آپ کو اس کا علم نہ ہو تو اس کی تحقیق و جستجو کریں۔ یہ آپ کا فرض بھی ہے اور بعد والوں کے لیے راہنمائی کرنے پر صدقہ جاریہ بھی۔

ستارویں نصیحت: تحقیق و مطالعے کے لیے فرصت نکالنا

کسی بھی موضوع پر لکھنے اور بولنے سے پہلے ضروری ہے کہ متعلقہ موضوع پر لکھی گئی کتب کا مطالعہ کیا جائے۔ مثلاً: رمضان المبارک کی آمد ہو تو روزے کی اہمیت، ضرورت اور فضیلت پر احادیث مبارکہ اور دیگر کتب کا مطالعہ کیا جائے۔ اس طرح سے آپ نہایت کم وقت میں اس موضوع کے جملہ مسائل و امور پر نہایت ضروری اور مفید معلومات جمع کر لیں گے، پھر اس موضوع پر بولنا اور لکھنا نہایت آسان ہو جائے گا۔ تجربے سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ ایک مفکر نے کیا خوب صورت بات کہی ہے:

وَمَنْ لَّمْ یُجَرِّبْ لَیْسَ یَعْرِفُ قَدْرَهٗ

فَجَرِّبْ تَجِدْ تَصْدِیْقَ مَا قَدْ ذَکَرْنَاهُ

"ناتجربہ کار اس کی قدر نہیں پہچانتا۔ آپ تجربہ کر لیں تو ہماری ذکر کردہ چیز کی تصدیق کو پا لیں گے۔"

اٹھارویں نصیحت: کم تر کاموں سے پرہیز کرنا

کم تر اور بے مقصد کاموں میں مصروف ہونے سے بچنا چاہیے۔ یہ شیطانی

چال ہوتی ہے کہ آپ ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کو نظروں سے اوجھل کر کے کم تر معاملات میں پڑ جائیں۔ اس سے نہ صرف آپ اپنے اصل مقصد کو بھول جائیں گے بلکہ ضیاعِ وقت سے اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ بھی کھو بیٹھیں گے۔

وزیر بن ہبیر نے کیا خوب کہا:

وَالْوَقْتُ اَنْفَسُ مَا عُنِيتَ بِحِفْظِهٖ　　وَاَرَاهُ اَسْهَلَ مَا عَلَيْكَ يَضِيْعُ

''وقت ایک نفیس ترین چیز ہے، جس کی حفاظت تمھارے ذمے لگی ہے، جبکہ میرے خیال میں یہی وہ چیز ہے جو نہایت آسانی کے ساتھ تم سے ضائع ہو رہی ہے۔''

انیسویں نصیحت: دین کے بنیادی امور سے غفلت نہ برتی جائے

بعض لوگ قرآن مجید، احادیث و تفاسیر اور اسلامی کتب کی ہر نئی اشاعت خریدنے کا شوق رکھتے ہیں اور اس پر اپنا سرمایہ خرچ کرتے ہیں اور بڑی بڑی علمی مجالس و محافل قائم کرتے ہیں لیکن فرض نمازوں سے غفلت برتتے ہیں۔ نماز کے اور دیگر ضروری مسائل کو جانتے نہیں، قرآن مجید کا کوئی حصہ بھی انھیں حفظ نہیں ہوتا۔ انھیں سوچنا چاہیے کہ مختلف کتب کی کئی کئی اشاعتیں جمع کرنے یا زرِ کثیر خرچ کر کے علمی مجالس کے انعقاد سے انھیں کیا فائدہ ہوگا بلکہ اُلٹا وبال بن سکتا ہے۔

بیسویں نصیحت: کتابیں بلا مقصد جمع نہ کی جائیں

بعض لوگوں کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ علمی و تحقیقی ضرورت ایک دوسرا معاملہ ہے لیکن کھیل کود، نئے نئے کپڑوں، برتنوں فرنیچر اور ڈاک ٹکٹ وغیرہ کی طرح کتابیں جمع کرنا بھی ایک شوق ہے۔ اس شوق میں اپنی ضرورت و

مقصد کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ بس یونہی کوئی نئی کتاب دیکھی اور اسے خرید لیا اور گھر میں لا سجایا۔ اس کا مطالعہ کرنا یا دوسروں کو مطالعے کے لیے دینا، اس طرف کم ہی توجہ ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

اِذَا لَمْ تَكُ حَافِظًا وَاعِيًا فَجَمْعُكَ الْكُتُبَ لَايَنْفَعُ

''جب آپ کتب کو یاد اور ضبط کرنے والے نہ ہوں تو کتابیں جمع کرنے کا شوق آپ کو کچھ فائدہ نہ دے گا۔''

میں اور آپ اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ ہم کئی سینکڑے کتب اور رسائل خرید سکیں۔ لیکن کیا یہ مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے کافی ہے؟ جبکہ ہمارا ہدف ہی صرف کتابوں کو جمع کرنا ہو۔

امام بیہقی رحمہ اللہ کے متعلق امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس کتبِ حوالہ، یعنی سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ بھی نہ تھی۔

ایسے ہی امام ابن حزم رحمہ اللہ کے پاس کچھ مصادر مہیا نہ تھے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے ان کے حالات میں یہ بات لکھی ہے کہ وہ سنن ابن ماجہ اور ابو عیسیٰ کی جامع کا تذکرہ نہیں کرتے اور نہ ہی انھوں نے ان دونوں کتب کو دیکھا ہے بلکہ یہ کتب تو ان کی موت کے بعد اندلس میں دستیاب ہوئی ہیں۔

ہماری اس بحث کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ کتب جمع کرنے کا شوق ہی نہیں ہونا چاہیے، نہیں بلکہ کتب خریدنا تو طالب علم کا وصفِ لازم ہونا چاہیے لیکن صرف لائبریری کی زینت بنانے کے لیے کتاب خریدنا اور نہ خود مطالعہ کرنا اور نہ کسی کو پڑھنے کے لیے دینا مذموم عمل ہے۔

اکیسویں نصیحت: کسی امام کی خاص اصطلاحات کو سمجھنا

کتابوں میں حوالے اور حواشی کے لیے بعض علماء اپنی خاص اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

❁ **پہلی مثال:** تقریب التهذیب میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے روایت کو بیان کرنے والوں کے لیے خفیہ علامت (کوڈ) استعمال کیے ہیں، مثلاً: وہ راویوں کے بارے میں حرف: خ م اور ق لکھتے ہیں۔ خ کا مطلب: بخاری اور م کا مطلب: مسلم اور ق کا مطلب: ابن ماجہ ہے۔ لیکن امام سیوطی رحمہ اللہ کی جامع الصغیر کو دیکھیں گے تو وہاں بھی یہی رموز ملیں گی۔ لیکن وہاں خ سے مراد: بخاری اور م سے مراد: مسلم اور ق سے مراد: متفق علیہ ہوگی۔

❁ **دوسری مثال:** متفق علیہ کی عبارت یقیناً معروف ومشہور ہے اور متفق علیہ سے مراد بخاری و مسلم ہیں۔ لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ متفق علیہ سے مراد احمد، بخاری ومسلم لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تمام کتب میں مشہور اصطلاح کی مخالفت کی ہے۔

❁ **تیسری مثال:** علم جرح وتعدیل میں ایک اصطلاح منکر الحدیث ہے، چنانچہ امام احمد جب کسی راوی کے بارے میں منکر الحدیث کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس راوی کی روایات یا احادیث کم ہیں۔ لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے اس اصطلاح کو کس معنی میں لیا ہے اس کے بارے میں وہ خود ہی رقمطراز ہیں:

كُلُّ مَنْ قُلْتُ فِيْهِ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ فَلَا تَحِلُّ الرِّوَايَةُ عَنْهُ.

''میں جس شخص کے بارے میں منکر الحدیث کا لفظ استعمال کروں اس سے روایت کرنا درست نہیں۔''

چوتھی مثال: امام زیلعی رحمہ اللہ کے نزدیک نصب الرایۃ میں الغریب سے مراد ہے: لَا أَصْلَ لَهٗ.

''اس کی کوئی اصل نہیں۔''

اور یہ غرابت امام ترمذی کے غریب کہنے کی مراد سے مختلف ہے۔

شیخ البانی رحمہ اللہ نے حدیث: مَنْ صَلّٰى خَلْفَ عَالِمٍ تَقِيٍّ فَكَأَنَّمَا صَلّٰى خَلْفَ نَبِيٍّ. ذکر کرنے کے بعد کہا: لَا أَصْلَ لَهٗ اس کی کوئی اصل نہیں اور آپ نے نصب الرایۃ میں امام زیلعی رحمہ اللہ کے قول غریب کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کی یہ عادت الھدایۃ میں موجود احادیث کے بارے میں ہے کہ: لَااَصْلَ لَهَا فِيْمَا كَانَ مِنْ هٰذَا النَّوْعِ. کہ اس قسم کے حوالے میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، یعنی آپ کی یہ اصطلاح انھی کے لیے خاص ہے، اس لیے ان کی یہ اصطلاح جاننے کے لیے پہلے مقدمہ پڑھنا ضروری ہے۔

بائیسویں نصیحت: کلام سمجھنے سے پہلے جواب نہ دینا

اس میں کلام کا پڑھنا یا سننا دونوں یکساں ہیں۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ایوب السختیانی رحمہ اللہ کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ کوئی سائل جب آپ سے سوال کرتا تو آپ اس کو سوال دوہرانے کا فرماتے۔ اگر وہ اپنے پہلے سوال کی طرح سوال دوہراتا تو آپ اس کو جواب دیتے ورنہ نہیں۔ یہی فہم و فراست ہر طالبِ علم کی ریت ہونی چاہیے گویا آپ زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ جب آپ اپنا سوال

یاد نہیں رکھ سکتے تو آپ اس کا جواب اپنے ذہن میں کیسے محفوظ رکھ سکیں گے۔

تیئیسویں نصیحت: کتب فتاوی کا کثرت سے مطالعہ کرنا

کتب کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا علم میں اضافے کا ذریعہ ہے۔ خصوصاً کتبِ فتاویٰ یعنی امور دین اور روزمرہ کے معاشرتی مسائل پر مبنی کتب کا مطالعہ تو نہایت ضروری ہے کیونکہ لوگوں کو نت نئے مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ ان مسائل کا جواب صرف علم دین رکھنے والوں ہی کے پاس ہوسکتا ہے، اس لیے عوام کو روزمرہ کی زندگی میں پیش آمدہ مسائل میں ان کی صحیح شرعی راہنمائی کرنے کے لیے کتبِ فتاوی کو زیرِ مطالعہ رکھنا چاہیے۔

چوبیسویں نصیحت: عمومی نفی کرنے میں جلد بازی سے پرہیز کرنا

شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انسان کے علم سے اس کی لاعلمی (جہل) زیادہ ہے۔ چنانچہ اگر آپ کسی بات کے بارے میں اچھی طرح جان بھی لیں تو آپ یہ کہنے کی تو طاقت رکھتے ہیں کہ فلاں فلاں بات میں نہیں جانتا لیکن یہ کہنے کی آپ طاقت نہیں رکھتے کہ فلاں فلاں بات ہے ہی نہیں کیونکہ آپ کے لیے یہ بات آسان ہے کہ آپ اپنے علم کی نفی کر دیں۔ لہٰذا آپ کو عمومی نفی کرنے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے، مثلاً: کسی امام کے بارے میں نفی کرنا یا کسی حدیث کے بارے میں نفی کرنا یا صحت حدیث سے نفی کرنا وغیرہ۔

حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں امام زہری کے حوالے سے ایک انوکھا واقعہ قلم بند کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک واعظ نے کوئی حدیث بیان کی تو میں نے کہا: یہ حدیث نبی کریم ﷺ کی سنن میں مذکور نہیں ہے۔ واعظ خاموش

ہو گیا۔ اتنے میں ایک لڑکا کھڑا ہوا اور اس نے کہا: اے امام! کیا آپ نے پوری سنن حفظ کی ہوئی ہیں؟ میں نے کہا: نہیں۔ اس نے پھر کہا: کیا آپ نے اس کا دو تہائی یاد کیا ہوا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ اس نے پوچھا کہ آپ نے اس کا نصف یاد کیا ہوا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ اس نے کہا: آپ وہ حصہ سامنے رکھیں جو آپ نے یاد کیا ہے۔ اور اس شیخ (واعظ) کی بیان کردہ حدیث کو اس نصف حصے میں شمار کریں جو آپ کو یاد نہیں۔ اس پر امام زہری رحمہ اللہ خاموش ہو گئے اور اس بچے کی قوتِ دلیل کا اقرار کیا۔

چنانچہ آپ بھی کسی مجمع یا مجلس میں یہ بات کہنے سے بچیں کہ یہ بات تو احادیث میں آئی ہی نہیں، یا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت نہیں۔ ممکن ہے آپ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے والے ہوں۔

میں منیٰ میں فضیلۃ الشیخ علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی مجلس میں عرصہ دراز تک شریک رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان سے کوئی سوال پوچھ لیا جاتا تو آپ جلدی سے یہ نہ کہہ دیتے تھے کہ یہ حدیث ہی نہیں ہے بلکہ آپ اس کے ضعف کو بیان فرما دیتے، یا یوں فرما دیتے کہ ایسا کرنا صحیح نہیں، یا اس کے قریب قریب کچھ فرماتے۔

شیخ فرماتے کہ کسی بھی حدیث کے بارے میں جلدی سے لَمْ يَرِدْ هٰذَا (یعنی کتبِ احادیث میں یہ حدیث موجود ہی نہیں ہے) کہہ دینا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے کے مترادف ہے کیونکہ بسا اوقات وہ حدیث دیگر ایسے طرق سے مروی ہوتی ہے جو آپ کے علم میں نہیں ہوتے تو اس صورت میں آپ کا عمومی نفی کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب شمار ہوگا۔ اگر کلام کرنا ضروری بھی ہے تو آپ یوں کہیں کہ یہ میرے علم کے مطابق ہے۔ یہی بات میں شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ

کے کلام سے سمجھا ہوں، چنانچہ آپ جب بھی کسی حدیث کے بارے میں بحث کریں اور اس کو کتب احادیث میں نہ پائیں تو آپ یوں کہا کریں کہ مجھے یہ حدیث میری استطاعت کے مطابق کہیں نہیں ملی۔

اسی لیے شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ:

بسا اوقات کسی جیّد عالم پر ایک چیز مخفی رہتی ہے لیکن ایک طالب علم اسے جان لیتا ہے۔

انھوں نے اس بارے میں سورۂ نمل میں موجود اللہ کا بیان کردہ وہ واقعہ ذکر کیا ہے کہ جب ایک ادنیٰ سا پرندہ ہُد ہُد ایک نبی اور بادشاہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے سامنے یہ اظہار کر رہا تھا:

﴿ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴾

''میں اس چیز کا احاطہ (علم) رکھتا ہوں جس کا آپ احاطہ نہیں رکھتے اور میں آپ کے پاس سبا سے یقینی خبر لایا ہوں۔'' [1]

چنانچہ آپ نفی کرنے میں جلدی نہ کریں کیونکہ یہ خود کو صاحب علم اور دوسرے کو علم سے عاری سمجھنے کے مترادف ہے۔ لیکن آپ ادب سیکھیں جیسے ہمارے علماء و اسلاف نے ہمیں ادب سکھایا ہے۔ وہ ہر مسئلے میں فتویٰ صادر کرنے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ:

هٰذا حَسْبَ عِلْمِنَا.

''یہ ہمارے علم کے مطابق ہے۔''

---

[1] النمل 22:27.

پچیسویں نصیحت: روایت بالمعنیٰ بیان کریں تو اس کی وضاحت کریں

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب جامع بیان العلم وفضلہ کے ایک باب کے تحت حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ، حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے کچھ آثار بیان فرمائے ہیں۔ انھوں نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کرتے تو فرماتے:

اَللّٰهُمَّ إِنْ لَمْ يَكُنْ هٰكَذَا فَكَشَكْلِهِ.

''اے اللہ! اگر یہ اس طرح نہیں ہے تو یہ اس کی صورت کی مانند ہے۔''

ایسے ہی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بارے میں ذکر فرمایا کہ آپ رضی اللہ عنہ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کرتے تو فرماتے:

أَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم.

''یا جیسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔''

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ ایک دن انھوں نے کوئی حدیث بیان کی اور کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح سنا، پھر آپ رضی اللہ عنہ پر لرزہ طاری ہو گیا اور خوفِ الٰہی سے کانپنے کی وجہ سے آپ کا کپڑا گر گیا، پھر آپ نے فرمایا:

أو نحو هذا، أو شبه هذا.

''یہ ایسے ہی ہے یا اس کی طرح ہے۔''

روایت بالمعنی کو ابن سیرین رحمہ اللہ کی طرح کچھ لوگوں نے منع قرار دیا ہے۔ لیکن درست بات یہی ہے جو جمہور محدثین کا مؤقف ہے کہ روایت بالمعنیٰ کچھ قیود

کے ساتھ جائز ہے۔ وہ قیود درج ذیل ہیں:

- عالم اپنی روایت کو جاننے والا ہو۔
- الفاظ میں ایسی تبدیلی نہ ہو کہ جس سے حکم ہی بدل جائے، یا حکم میں کمی بیشی ہو جائے۔
- حدیث ایسی نہ ہو جس کے الفاظ ہی عبارت ہوں جیسے اذکار اور دعائیں وغیرہ۔

کچھ محدثین رحمہم اللہ حدیث کے کسی حرف میں شک کی بنا پر حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس صورت میں مشکل مقام یہ ہے کہ انسان حدیث کے الفاظ یاد کرنے کی پابندی کرے۔ اسی بنا پر جب کوئی کسی حدیث کو بیان کرے اور اسے لگ رہا ہو کہ اس کا کچھ حصہ اس کے ذہن سے مخفی ہے تو وہ اس کا کچھ حصہ بیان کر کے یوں کہہ دے:

أَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ.

''یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔''

یہاں امام احمد رحمہ اللہ کی بیان کردہ وہ حدیث بھی پیش نظر رہنی چاہیے جس کے سمجھنے میں کچھ لوگ غلطی کر جاتے ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے:

إِذَا حَدَّثْتُكُمْ حَدِيثًا فَلَا تَزِيدُنَّ عَلَيْهِ.

''جب میں تم سے کوئی حدیث بیان کروں تو تم اس پر اضافہ نہ کرو۔''[1]

اس سے مراد یہ نہیں کہ آدمی اپنے پر حدیث کو بالحروف روایت کرنا لازم کر لے بلکہ مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا اضافہ مت کیا جائے کہ جس سے حکم ہی بدل جائے یا کسی دوسرے علم کا اضافہ ہو جائے۔

---

[1] مسند أحمد: 11/5، والسلسلة الصحيحة: 345/1، حديث: 346.

چھبیسویں نصیحت: تعریفی اور تعظیمی القابات سے بچنا

ایسے القابات سے طالب علم کے لیے بچنا ہی مناسب ہے کیونکہ یہ انسان کو خود پسندی کا شکار کر دیتے ہیں اور جب بھی انسان اپنی مدح یا اپنی ذات کے لیے مختلف القابات اور تعریفی و تعظیمی الفاظ و کلمات سے پرہیز کرنے کو اپنی عادت بنا لیتا ہے تو اُس میں عاجزی و انکساری آ جاتی ہے۔ لیکن جو شخص ان القابات کو اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہو وہ اپنے آپ کو خطا و غلطی سے پاک سمجھنے لگتا ہے اور جب انسان خود کو پاک و صاف سمجھنا شروع کر دے تو وہ اپنے اوپر بہت سی خیر و بھلائی کا دروازہ بند کر لیتا ہے۔

آپ دوسروں پر اپنی بڑائی اور علمیت ہرگز نہ جتلائیں بلکہ ہمیشہ عاجزی و انکساری اختیار کریں۔ جلد ہی اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے فضل سے رفعت و عروج عطا فرمائے گا۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا:

تَوَاضَعْ تَكُنْ كَالنَّجْمِ لَاحَ مَنَاظِرٌ　　عَلٰى صِفَاتِ الْمَاءِ وَهُوَ رَفِيعُ
وَلَاتَكُ كَالدُّخَانِ يَرْفَعُ نَفْسَهُ　　إِلٰى طَبَقَاتِ الْجَوِّ وَهُوَ وَضِيعُ

''تو عاجزی اختیار کر تو اس ستارے کی طرح ہو جائے گا جو پانی کی سطح پر بھی دیکھنے والے کو بلند نظر آتا ہے اور تو اس دھوئیں کی مانند نہ ہو جا جو خود کو فضا کے طبقات کی طرف بلند کرتا ہے حالانکہ وہ پست ہوتا ہے۔''

جس ستارے کو آپ پانی میں دیکھتے ہیں وہ حقیقت میں بلند ہوتا ہے اور دھوئیں کی اصل جگہ زمین ہے لیکن وہ خود کو بہت اونچا اڑاتا ہے۔

ہم شاعر کے قول سے بہت بہتر نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں جسے

امام مسلم وابوداود رحمہما اللہ نے بیان کیا ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ أَوْحٰى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوْا وَلَا يَبْغِى بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ.

''اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی کی ہے کہ تم آپس میں تواضع اختیار کرو اور ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرو۔''[1]

دوسری حدیث میں فرمایا:

مَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ.

''جو اللہ کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے اللہ اسے بلند کر دیتا ہے۔''[2]

ستائیسویں نصیحت: نصیحت وتنقید کو فراخ دلی سے قبول کرنا

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: «اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ» ''دین خیر خواہی کا نام ہے۔''[3] اس حدیث مبارکہ کو پیش نظر رکھیں تو دینی ومعاشرتی معاملات میں ایک دوسرے کی نصیحت خوش دلی سے قبول کرنی چاہیے۔ نصیحت میں تنقید بھی شامل ہے لیکن تنقید طنزیہ انداز میں نہیں بلکہ محبت اور اخلاص سے ہو۔ سرِ عام نہیں بلکہ علیحدگی میں ہو۔

اٹھائیسویں نصیحت: بے فائدہ بحثوں میں وقت ضائع کرنے سے بچنا

ایسے مسائل کہ جن کا پیش آنا ممکن نظر نہ آتا ہو یا اگر وہ پیش تو آ چکے ہوں

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب الصفات التی یعرف بها اهل الجنة، حدیث: 2765.

[2] صحیح مسلم، کتاب البروالصلة، باب استحباب العفو والتواضع، حدیث: 2588.

[3] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان أن الدین النصیحة، حدیث: 55.

لیکن ان پر بحث و تحقیق کرنا بے فائدہ ہو تو ان امور پر گفتگو کر کے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر اصحاب کہف کے کتے کا رنگ سرخ تھا یا زرد؟ وہ ایسا تھا یا ایسا تھا؟ اگر وہ زرد ہو تو اس سے کیا ہوگا اور اگر سرخ ہو تو کیا ہوگا؟ بعض لوگ اس طرح کی فضول بحثوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو جس درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا وہ فلاں فلاں تھا۔ حالانکہ اس درخت کے بارے میں جاننا نہ تو ایمان کا حصہ ہے اور نہ جاننے سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہے۔ اس طرح کی بے فائدہ بحث و تحقیق سے پرہیز کرنا چاہیے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے مقدمہ اصول تفسیر میں اس طرح کی بحثوں پر شدید تنقید کی ہے۔

اُنتیسویں نصیحت: ایک مسئلے کی تحقیق کے دوران دیگر مسائل میں پڑنے سے اجتناب

ابن جماعہ رحمہ اللہ اور دیگر اصحابِ علم نے بیان کیا ہے کہ جب کسی مسئلے میں کتب کی چھان بین کر رہے ہوں تو اس دوران دیگر امور میں بحث کرنے سے پرہیز کریں۔ لیکن اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو قلم سے اس پر بطور یادگار چھوٹی سی علامت لگا دیں، پھر جب مطلوبہ مسئلے کی بحث سے فارغ ہو جائیں تو نشان زدہ عبارتوں پر نظر دوڑا لیں۔

تیسویں نصیحت: بغیر علم کے گفتگو نہ کرنا اور سوال کا جواب نہ دینا

آپ کسی مجلس میں ہوں اور حاضرین اپنی علمی تشنگی دور کرنے اور مسائل میں

راہنمائی حاصل کرنے کے لیے آپ سے سوالات کرنے لگیں تو ایک سوال ادھر سے اور دوسرا سوال ادھر سے ہو اور آپ ان دونوں کے جواب نہیں جانتے لیکن آپ اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور کوشش کر کے کوئی عمومی بات تلاش کر لیتے ہیں، مثلاً: مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے یہ سنا تھا فلاں شیخ نے یوں کہا تھا، شاید کہ اس کا جواب یوں ہے۔ یہ طریق کار صحیح نہیں ہے، اس طرح کا گول مول جواب دینے کے بجائے مسئلے کا ٹھوس اور یقینی جواب بتانا چاہیے، یا پھر سیدھے طریقے سے لاعلمی کا اظہار کر دینا چاہیے تاکہ سائل اپنے مسئلے کا جواب کہیں اور سے ڈھونڈ لے۔

امام مالک رحمہ اللہ کا یہ قصہ بہت مشہور ہے کہ اندلس سے ایک آدمی ان کے پاس آیا اور اس نے آپ سے بیالیس سوال کیے۔ آپ نے صرف دو کا جواب دیا اور چالیس سوالوں کے جواب میں کہا: لَا أَدْرِيْ ''میں نہیں جانتا۔'' آدمی نے حیرت سے کہا: آپ امام مالک رحمہ اللہ ہیں اور ان کے جواب نہیں جانتے؟ آپ رحمہ اللہ نے فرمایا: ہاں، جاؤ اور سارے لوگوں کو بتلا دو کہ مالک کو ان سوالات کے جواب نہیں آتے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس شخص پر جواب دینا فرض ہے جسے اللہ نے علم سے نوازا ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے کہا:

﴿ أَنۢبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ ﴾

''تو انھیں ان کے ناموں کی خبر دے۔''

بالکل اسی طرح علم نہ رکھنے والے پر سکوت فرض ہے۔ جیسا کہ فرشتوں نے کہا:

﴿ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ ﴾

"جو تُو نے ہمیں سکھایا ہم تو صرف وہی جانتے ہیں۔"

امام غزالی رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

لَوْ سَكَتَ مَنْ لَّا يَعْرِفُ قَلَّ الْاِخْتِلَافُ.

"اگر نہ جاننے والے خاموش ہو جائیں تو اختلاف کم ہو جائے۔"

اور نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ.

"جو شخص اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ بھلائی کی بات کہے یا خاموش رہے۔" [1]

چنانچہ کسی کو بھی لاعلمی کا اظہار کرنے میں حرج محسوس نہیں کرنا چاہیے اور یہی ہمارے سلف صالحین کا طریق کار ہے۔ میں نے خود فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ کو بعض دروس و لیکچرز میں لَا أَدْرِيْ، لَا أَعْلَمُ کہتے سنا ہے۔

ابن جماعہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ عالم یا شیخ اپنے شاگردوں کو ان مسائل میں کہ جن کا انھیں علم نہ ہو، لاأدری "میں نہیں جانتا" کہنے کی تلقین کریں، یعنی استاذ پر تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ تربیت کرنا بھی لازم ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کو اس بات کی تلقین کرتے رہیں کہ اگر تمھیں کسی مسئلہ کا جواب نہ آئے تو اس میں ادھر ادھر کی مارنے یا غلط جواب دینے کی بجائے صاف طور پر لاعلمی کا اظہار کر دو اور سائل کو کسی بڑے عالم کی طرف رجوع کے لیے کہہ دو۔

[1] صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره، حديث: 6018، صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب الحث على على إكرام الجار والضيف والزوم الصمت، حديث: 47.

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عالم لَا أَدْرِی کا اقرار کرنے میں غلطی کرتا ہے تو لڑائی پڑ جاتی ہے۔اور اِنَّكَ لَا تَدْرِیْ جیسے الفاظ نزاع واختلاف کا باعث بنتے ہیں۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؂

وَمِنْ اَعْجَبِ الْاَشْیَاءِ اَنَّكَ لَاتَدْرِیْ وَأَنَّكَ لَاتَدْرِیْ بِأَنَّكَ لَاتَدْرِیْ

''یقیناً یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آپ نہیں جانتے مگر آپ کو اس بات کا بھی علم نہیں ہے کہ آپ نہیں جانتے۔''

بعض لوگ آپس میں مذاکرہ کرتے ہیں اور ہر بات کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ کسی بات کا جواب نہ بھی آتا ہو پھر بھی زور آزمائی ضرور کریں گے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جب وہ لَاأَدْرِیْ کہیں گے تو یہ بات ان کی شخصیت کے منافی ہو گی اور یوں ان کی مقبولیت اور علمی حیثیت میں کمی واقع ہو گی۔ یہی تو شیطانی حملہ ہے۔حالانکہ اگر آپ لَاأَدْرِیْ کہہ دیں گے تب بھی آپ کو اجر ملے گا اور اس سے لوگوں کے نزدیک آپ کے مقام میں کوئی فرق بھی نہیں آئے گا بلکہ اچھا تاثر پڑے گا۔



وقت کی قدر واہمیت

وقت کا درست اور صحیح استعمال ہی حصولِ علم اور دیگر معاملات کو نتیجہ خیز بنانے میں اہم اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں ہم انسانی زندگی میں وقت کی قدر و اہمیت کے پیش نظر کچھ معروضات پیش کریں گے۔

وقت کیا ہے؟

وقت زندگی ہے۔ جی ہاں! یہ سیکنڈ، منٹ اور گھنٹے، ہماری زندگی ہی تو ہیں۔ اور یہ زندگی گھڑی کی طرح ایسے چلتی جاتی ہے کہ گزرا ہوا سیکنڈ، منٹ اور گھنٹہ واپس نہیں آتا۔

فرانس کے ادیب وولٹائر لکھتے ہیں:

وقت ایسی چیز ہے جو دنیا کی چیزوں میں سے سب سے زیادہ طویل مگر سب سے مختصر بھی، بہت زیادہ تیز رفتار بھی اور بہت سست بھی، اسی کی سب سے زیادہ لوگوں کو طلب ہوتی ہے اور اسی کے بارے میں لوگ بہت لا پروائی بھی برتتے ہیں، اسی کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا جاتا ہے مگر اسی کے گزر جانے پر بہت افسوس کیا جاتا ہے اور اس کو نظر انداز کیا جائے تو بہت سے کام اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں اور اسی کی بدولت بہت سی چیزوں کو تاریخ میں دوام نصیب ہوتا ہے۔

وقت کی اہمیت

دنیا میں ہمیشہ انھی لوگوں نے کامیابیاں حاصل کی ہیں جنھوں نے وقت کی اہمیت کو اپنے پیشِ نظر رکھا اور اپنے نصب العین کی جانب پیش قدمی کی۔ اسلامی تاریخ کا وہ درخشاں دور کہ جب مسلمانوں کی جاہ وعظمت کا جھنڈا پوری دنیا میں لہرا رہا تھا، وہ وقت کی قدر کرنے کا ثمر ہی تھا، وگرنہ بہت سی ایسی قوموں کے تذکرے بھی تاریخ نے اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں جنھوں نے وقت کی قدر نہ کی۔ اسی وجہ سے انھوں نے زوال وانحطاط کا مُنہ دیکھا۔

وہ افراد اور قومیں، جنھوں نے وقت کی نبض کو اپنے ہاتھ میں لیا اور علمی وفکری بنیادوں پر نمایاں خدمات انجام دی ہیں، تاریخ میں ان کا تذکرہ پتھر پر لکیر کی طرح ثبت ہے۔ ان کے بعد کی قوموں اور افراد نے انھی کی محنت سے عظمت کا سبق سیکھا اور نشانِ راہ پایا ہے۔ لیکن جن افراد اور قوموں نے وقت کی قدر نہ کی، تاریخ نے انھیں حرفِ غلط اور پانی کے بلبلے کی طرح ایسے مٹا دیا کہ ان کے تذکرے سے لوگ عبرت پکڑتے ہیں۔

ضیاعِ وقت، ایک المیہ!

ہر دور کا یہ المیہ رہا ہے کہ جہالت، کم علمی اور متعین مقصد پیشِ نظر نہ ہونے کی وجہ سے اکثر لوگ بلکہ قومیں اور ملک اپنے اوقاتِ کار کی تقسیم نہیں کر پاتے، اس وجہ سے دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے کتنے ہی گھنٹے بیکار چلے جاتے ہیں۔ یہ دراصل مخلص اور دیانت دار قیادت کے فقدان کا نتیجہ ہے، ورنہ دنیا میں جن ملکوں اور قوموں نے ترقی کی ہے، ان کی قیادت نے قوم کو وقت کے ساتھ چلنا سکھایا

ہے۔ تاریخ میں بھی اور موجودہ دور میں بھی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ بعض ملک وقت کی قدر اوراس سے کما حقہ استفادہ کرنے کی وجہ سے گھڑی کی سوئی سے آگے نکل گئے۔

شاعر نے وقت کی قدر نہ کرنے کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

وَالْوَقْتُ اَنْفَسُ مَا عُنِيْتَ بِحِفْظِهٖ　　وَأَرَاهُ أَسْهَلَ مَا عَلَيْكَ يَضِيْعُ

''وقت ایک نفیس ترین چیز ہے، جس کی حفاظت تمھارے ذمے لگائی گئی ہے جبکہ میرے خیال میں یہی وہ چیز ہے جو نہایت آسانی کے ساتھ تم سے ضائع ہو رہی ہے۔''

فراغت کو غنیمت جانیے!

نبی مکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ»

''صحت اور فراغت دو ایسی نعمتیں ہیں جن کے بارے میں اکثر لوگ دھوکے کا شکار ہیں۔''[1]

نبی کریم ﷺ نے اس فرمانِ عالی شان میں دو چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بہت سے لوگ ان کے بارے میں دھوکے اور غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں، یعنی جب یہ چیزیں انھیں میسر ہوتی ہیں تو وہ ان کی قدر نہیں کر پاتے لیکن جب یہ ان سے چھن جاتی ہیں تب انھیں ان کی قدر واہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ پہلی نعمت صحت ہے، جب انسان تندرست وتوانا ہوتا ہے تو اپنی اس صحت یابی کی زندگی سے

[1] صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب لا عيش إلا عيش الآخرة، حديث: 6412.

فائدہ نہیں اٹھاتا اور جب بسترِ مرض پر پڑ جاتا ہے تو تب اسے احساس ہوتا ہے کہ میں نے کس قدر اپنا نقصان کیا ہے۔ اسی طرح دوسری نعمت فراغت ہے، جب انسان کے پاس وقت وافر ہوتا ہے اور وہ اپنا قیمتی وقت عبث کاموں میں گزارتا رہتا ہے لیکن جب فراغت کی یہ نعمت اس سے چھن جاتی ہے تو پھر وہ پچھتاتا ہے کہ میں نے اس فراغت سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا اور اپنے اس قیمتی وقت کو کارآمد کیوں نہ بنایا۔ بقول شاعر:

لَيْتَ الشَّبَابَ يَعُوْدُ يَوْمًا فَأُخْبِرَهُ بِمَا فَعَلَ الْمَشِيبُ

''کاش کہ کسی دن جوانی لوٹ آئے تو میں اسے بتلاؤں کہ بڑھاپے نے (میرے ساتھ) کیا کچھ کیا ہے۔''

زمانے کی تقسیم کچھ نہیں

زمانے کی تین قسمیں کی جاتی ہیں:

- ماضی (گذشتہ) ● حال (موجودہ) ● مستقبل (آئندہ)

اگر دیکھا جائے تو انسان کے لیے یہ تقسیم کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے لیے صرف ایک ہی زمانہ ہے اور وہ ہے ''حال'' یعنی موجودہ کیونکہ ماضی تو اب اس کے لیے کچھ رہا ہی نہیں، اس لیے کہ وہ گزر چکا ہے اور جو وقت ایک بار گزر جائے لوٹ کر نہیں آتا۔ اور نہ ہی اس سے کچھ فائدہ حاصل ہوسکنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ لیکن ماضی میں کی گئی کوتاہیوں کو دوہرانے سے اجتناب اور اپنے حال پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کردینی چاہیے۔

اسی طرح مستقبل (آئندہ) ہے، یعنی ایک ایسا زمانہ جس میں ابھی تک آپ

پہنچے ہی نہیں ہیں اور اس تک پہنچنے کی کوئی گارنٹی بھی نہیں ہے تو اس سے امیدیں لگائے رکھنا، یا اپنے امور و مشاغل کو مستقبل میں نمٹانے کی آس لگائے رکھنا بھی سراسر حماقت ہے کیونکہ زندگی کی گاڑی نہ جانے کب چلتے چلتے رُک جائے۔ اس کا کسی کو علم نہیں کہ مستقبل تک ہم نے پہنچنا بھی ہے یا نہیں تو پھر اس کا انتظار کیوں؟ لہٰذا ہر شخص کو اپنے لیے صرف اور صرف ایک ہی زمانہ متعین کرنا چاہیے اور وہ ہے حال۔ اپنے حال یعنی موجودہ زمانے ہی کو غنیمت سمجھیں، اسی میں سب کچھ کرنے کا ارادہ رکھیں اور اس سے بھر پور فائدہ اٹھائیں تاکہ جو کام ماضی میں نہیں ہو سکا اُس کی تلافی ہو سکے اور اسی طرح اگر مستقبل کو نہ پا سکیں تو کوئی خواہش اور امید ادھوری نہ رہ جائے۔

وقت سے استفادہ اور دعا

ہر انسان کو اپنی زندگی میں کچھ کرنے کے لیے وقت کو غنیمت سمجھنا چاہیے، اس کی قدر و اہمیت کو جاننا چاہیے اور اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہیے۔ اپنے کسی بھی کام کو کل پر مت چھوڑیں کیونکہ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ کل تک تم زندہ رہو گے، لہٰذا اپنے آج کو ہی سب کچھ سمجھنا چاہیے۔ فضول اور عبث کاموں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے علم و عمل میں اسے صَرف کیا جائے۔ اپنے امور و معاملات کی ترجیحات کو پہچانیے۔ عبث کاموں کو چھوڑیے اور اہم و فائدہ مند امور کو ان پر ترجیح دیجیے۔ اس میں چنداں شک نہیں کہ وقت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس میں بھی دو رائے نہیں کہ روزِ قیامت دوسری تمام نعمتوں کی طرح اس نعمت کے بارے میں بھی انسان سے سوال کیا جائے گا، چنانچہ

ضروری ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کو بہتر بنانے اور اخروی زندگی کو سنوارنے کے لیے وقت کی قدر و اہمیت کو اپنے دل و دماغ میں جاگزیں کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت اہم معاملہ یہ ہے کہ جہاں وقت سے استفادے کی اپنے لحاظ سے تمام تر کوششیں کی جائیں وہاں اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہیں کہ وہ ہمارے اوقات میں برکت فرمائے اور ہمیں اس سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جیسا کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ صَلَاحَ السَّاعَاتِ وَالْبَرَكَةَ فِي الْاَوْقَاتِ.

''اے اللہ! ہم تجھ سے ساعاتِ زندگی کی بہتری اور اوقات میں برکت کا سوال کرتے ہیں۔''

وقت کی اہمیت، اسلاف کی نظر میں

ہمارے اسلاف کرام رحمہم اللہ نے علمی و عملی زندگیوں میں جو عالی مقام حاصل کیا اور ہر میدان میں جس طرح اپنا لوہا منوایا ہے، یہ سب وقت کی قدر کرنے اور اسے اپنے کام میں لانے ہی کے بدولت ہے۔ ان کی عالی ہمت اور جذبہ و شوق کا اندازہ ان کی علمی خدمات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی نظر میں وقت کی کس قدر اہمیت تھی؟ آیئے ملاحظہ فرمائیں:

- امام بخاری رحمہ اللہ کے متعلق ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں ایک سفر میں امام بخاری کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپ رات کو بیس بیس مرتبہ اٹھتے، چراغ جلاتے اور احادیث پر کچھ نشان لگا کر پھر لیٹ جاتے۔[1]

---

[1] تهذيب الأسماء واللغات: 75/1.

❁ امام مسلم رحمہ اللہ سے کسی نے کوئی حدیث دریافت کی لیکن اس وقت امام صاحب کو وہ حدیث یاد نہیں تھی۔ آپ گھر تشریف لے گئے اور چراغ جلا کر حدیث کی تلاش شروع کردی۔ گھر والوں نے کھجوریں پیش کیں۔ آپ حدیث تلاش کرتے رہے اور ساتھ ساتھ کھجوریں بھی کھاتے رہے۔ محویت کا یہ عالم کہ پوری رات حدیث کی تلاش وجستجو میں گزار دی اور یہ بھی خیال نہ رہا کہ کھجوریں کچھ زیادہ ہی کھا لی گئیں تھیں جو موافق نہ آسکیں اور اسی کے باعث بیمار ہوئے اور انتقال فرما گئے۔[1]

❁ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے لیے شب و روز کا نظام الاوقات قائم کر رکھا تھا۔ آپ اس نظام الاوقات کے سخت پابند تھے۔ آپ نے رات کے تین حصے کیے ہوئے تھے: پہلا حصہ علم کے لیے، دوسرا عبادت کے لیے اور تیسرا آرام کے لیے مقرر تھا۔[2]

❁ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بارے میں ذکر ہے کہ آپ صبح سے ظہر تک تعلیم وافتاء اور لوگوں کی حاجات وضروریات پوری کرنے میں مشغول رہتے، ظہر سے مغرب تک کا وقت بھی علم وعبادت اور خدمتِ خلق میں گزارتے، پھر مغرب پڑھتے اور اسباق شروع ہوجاتے، عشاء کے بعد درس ومطالعہ کا سلسلہ شروع ہوتا حتیٰ کہ رات کا اکثر حصہ اسی میں گزر جاتا۔[3]

❁ امام زہری رحمہ اللہ نے صرف 80 دن میں مکمل قرآن کریم حفظ کرلیا تھا۔[4]

❁ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ کی وفات کے بعد جب آپ کے شاگردوں نے آپ کی تصانیف کا یومیہ حساب سے اندازہ لگایا تو ان کی تمام عمر کے ہر دن میں

---

[1] تهذيب التهذيب: 127/10. [2] حلية الاولياء: 130/9. [3] الكواكب الدرية: 156.
[4] تذكرة الحفاظ: 410/1.

چودہ ورق تقسیم ہوئے۔ اس طرح آپ نے اپنی زندگی میں تین لاکھ اٹھاون ہزار اوراق لکھے۔ (1)

❁ امام ابن القیم الجوزی رحمہ اللہ وقت کی قدر کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں لایعنی ملاقاتوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں اور اگر ناگزیر ہوں تو اس دوران بھی بہت سے کام نمٹا لیتا ہوں، مثلاً: قلم کا قط لگانا، کاغذ کاٹنا اور اس طرح کے دیگر ہلکے پھلکے کام تاکہ ملاقات بھی ہو جائے اور وقت بھی ضائع نہ ہو۔ (2)

❁ امام ابن ابی حاتم رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ والد صاحب کھانا کھا رہے ہیں اور میں ان سے پڑھ رہا ہوں، وہ راستے میں چل رہے ہیں اور میں پڑھ رہا ہوں اور وہ اپنے کسی کام میں مصروف ہیں تو تب بھی میں ان سے پڑھ رہا ہوں۔ (3)

❁ امام عبید بن یعیش رحمہ اللہ امام بخاری رحمہ اللہ و امام مسلم رحمہ اللہ کے شیخ ہیں۔ ان کے بارے میں امام ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تیس سال تک ان کو ان کی بہن خود رات کا کھانا کھلاتی رہی اور وہ کھانے کے دوران لکھنے میں مصروف رہتے۔ (4)

❁ امام خلیل بن احمد الفراہیدی رحمہ اللہ علم النحو کے امام تھے، فرماتے ہیں:

أَثْقَلُ السَّاعَاتِ عَلَيَّ سَاعَةٌ آكُلُ فِيهَا.

''دن رات کے تمام اوقات میں میرے لیے سب سے گراں وہ وقت ہوتا ہے جس میں میں کھانا کھاتا۔'' (5)

---

(1) تاریخ بغداد: 163/2، قیمۃ الزمن: 43. (2) قیمۃ الزمن: 59. (3) سیر أعلام النبلاء: 251/13. (4) سیر أعلام النبلاء: 458/11. (5) قیمۃ الزمن: 28.

ضیاعِ وقت کے اسباب

بہت سارے طلبہ قلّتِ وقت کی شکایت کرتے ہیں یا عدمِ ترتیب اوقات کی بنا پر پریشان ہوتے ہیں تو ان دونوں وجوہ کے لحاظ سے طلبہ کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں: جو قلّتِ وقت کی شکایت کرتے ہیں۔ وہ وقت کی قدر و اہمیت سے تو واقف ہوتے ہیں اور اس سے کما حقہ فائدہ بھی اٹھاتے ہیں مگر وہ اپنا بہت سارا قیمتی وقت عدمِ واقفیت سے ضائع کر رہے ہوتے ہیں، جس کا ہم آئندہ ذکر کریں گے لیکن جو طلبہ اپنے اوقات کار کی صحیح تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں تو یہ دراصل ان کی اپنی لاپروائی اور سستی ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اہم اور غیر اہم امور میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور وہ تمام کاموں کو یکساں وقت دے رہے ہوتے ہیں، جس کی بنا پر وہ اپنا بہت سارا قیمتی وقت عبث کاموں میں گنوا دیتے ہیں۔

یہاں ہم اُن اسباب کا ذکر کریں گے کہ جو وقت کے ضیاع کا باعث بنتے ہیں:

1 احباب سے کثرتِ میل جول

اس معاملے میں بہت سے لوگ افراط و تفریط کا شکار رہتے ہیں کہ یا تو دوستوں سے بالکل قطع تعلق ہو جانا کہ اسلامی تعلق اور اخوت و محبت متاثر ہونے لگے یا پھر اس قدر اس کا اہتمام کرنا کہ واجبات ہی چھوٹنے لگیں۔ ان دونوں صورتوں کے بجائے اعتدال کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

دوستوں سے ملنا جلنا آپس میں رابطہ اور تعلق بحال رکھنے کا بہت عمدہ ذریعہ ہے بلکہ جب بھی کوئی بندہ اپنے مسلمان بھائی سے ملتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے۔

ہر طالب علم کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ باہمی تعلق اور رابطے کو قائم رکھنے کے لیے ہر روز ملاقات کرنا ضروری نہیں ہے، روزانہ ملاقات نہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باہمی تعلق میں کمی واقع ہوگئی ہے کیونکہ ہر ملاقات محبت کی وجہ نہیں بنتی اور ہر غیاب یعنی ملنے کے لیے کسی کے ہاں نہ جانا قطع تعلقی کی علامت نہیں ہوتی۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إِنَّ لَنَا إِخْوَاناً لَانَرَاهُمْ إِلَّا فِيْ كُلِّ سَنَةٍ مَرَّةً أَوْثَقُ بِمَوَدَّتِهِمْ مِمَّنْ نَرَاهُمْ كُلَّ يَوْمٍ.

''ہمارے بعض بھائی ایسے ہوتے ہیں جن کی ہم سال بھر میں ایک بار ہی زیارت کر پاتے ہیں مگر ان کی محبت ایسے لوگوں کی نسبت زیادہ گہری ہوتی ہے جنھیں ہم روز ملتے ہیں۔''

اب اگر دیکھا جائے تو ایسے طلبہ اپنی پڑھائی کا کثیر وقت ایسی ہی فضولیات میں ضائع کر دیتے ہیں، مثلاً: اگر وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں سے کم از کم ایک گھنٹہ بھی دوستوں کی بے فائدہ مجلس میں ضائع کرتے ہیں تو اس حساب سے ہفتے میں سات گھنٹے اور ایک مہینے میں اوسطاً تیس گھنٹے، یعنی صرف ایک فضول کام کو ترک نہ کرنے سے گویا ہر ماہ ایک مکمل دن سے بھی زیادہ وقت ہم ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر اس طرح کی محافل و مجالس میں شرکت سے گریز کیا جائے اور یہی وقت

حصولِ علم کے لیے وقف کیا جائے تو کثیر علمی منافع کا حصول ممکن ہوسکتا ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجالس کی دو قسمیں ہیں:

- ایک وہ کہ جو صرف تفریحِ طبع اور وقت پاس کرنے کے لیے لگائی جاتی ہے۔ اس کے نقصانات اس کے فوائد سے زیادہ ہیں اور سب سے کم تر نقصان تو یہی ہے کہ اس میں بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے۔
- دوسری وہ مجلس کہ جو آپس میں علمی مذاکرے اور عملی محاسبے کے لیے لگائی جائے۔ یہ بہت ہی زیادہ نفع بخش اور باعثِ اجر وثواب ہے۔ لیکن اس میں بھی تین طرح کے نقصانات کا شائبہ موجود ہوتا ہے:

1. ایک دوسرے کے خصائل و فضائل بیان کرنے یا اپنا علمی مرتبہ اور عملی مقام جتلانے میں ہی سارا وقت ضائع کر دیا جائے۔
2. ضروری کاموں سے زیادہ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونا شروع ہو جائیں۔
3. ایسی مجلس کو عادت و خواہش ہی بنا لیا جائے کہ جس سے مقصودِ اصلی ہی فوت ہو جائے۔

اگر علمی مذاکرے و عملی محاسبے کی مجالس میں مذکورہ بالا تین امور پیش نظر ہوں تو وہ بھی مفید کے بجائے مُضر بن جائے گی۔[1]

2 تفریح اور سیر و سیاحت میں مصروف رہنا

ایسے طلبہ پڑھائی کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں اور دوست و احباب سے ملاقات، نیند اور تفریح اور سیر و سیاحت کو سرِفہرست رکھتے ہیں۔ اگر وہ کبھی کبھار

[1] الفوائد: 51.

پڑھنے بھی لگیں تو تھوڑا سا پڑھ کر اکتاہٹ اور تھکاوٹ محسوس کرنے لگیں گے اور سمجھیں گے کہ ہم نے بہت پڑھ لیا ہے، پھر تازہ دم ہونے کے لیے پڑھائی سے کہیں زیادہ وقت تفریح میں گزار دیتے ہیں۔ حالانکہ تفریح کی افادیت و اہمیت سے کوئی بھی انکاری نہیں ہے بلکہ تفریح بہت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن ایک مناسب وقت پہ اور مناسب حد تک۔

امام ابن القیم الجوزی رحمہ اللہ تلبیس ابلیس میں ذکر کرتے ہیں:

جب کوئی طالبِ علم پڑھنے کے لیے بیٹھتا ہے تو کچھ ہی دیر بعد شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ تُو نے بہت پڑھ لیا ہے۔ تُو ان سے تو بہتر ہے جنھوں نے کچھ پڑھا ہی نہیں ہے، لہٰذا اب تجھے تھوڑا سا آرام کر لینا چاہیے۔ طالب علم اس کے بہکاوے میں آ کر پڑھائی میں صَرف کیے گئے وقت سے کہیں زیادہ تفریح میں وقت ضائع کر دیتا ہے۔

فضول کاموں میں محویت

ضیاعِ وقت کا تیسرا سبب یہ ہے کہ طالب علم خود کو فضول اور غیر ضروری کاموں میں مشغول رکھے اور وہ ان کاموں کو پڑھائی پر ترجیح دے جو درحقیقت بے فائدہ اور غیر اہم ہوں۔ مثال کے طور پر ذاتی یا گھریلو کام جو چھٹی کے وقت میں کیے جانے والے ہوں انھیں پڑھائی کے وقت میں کرے اور کلاس میں حاضر نہ ہو سکے اور استاذ کے بتائے ہوئے بہت سے علمی نکات وفوائد سے محروم رہ جائے۔

کلاس کا وقت ضائع کرنے سے بڑا نقصان اور کوئی نہیں ہے کیونکہ اس سے ضیاعِ وقت کے علاوہ بے شمار نقصان ہوتے ہیں، مثلاً: کتاب کا ایک درس چھوٹ

جاتا ہے۔ وہ سبق اگر کسی ساتھی سے پڑھ بھی لیا جائے تو تلافی ناممکن ہے کیونکہ جس انداز سے استاد نے پڑھایا ہوتا ہے اس کمال سے کوئی نہیں پڑھا سکتا، پھر ہر بحث اور ہر مسئلے میں استاد بے شمار نکات وفوائد بتلاتے ہیں تو ان سے بھی طالبِ علم محروم ہوجاتا ہے اور پھر مختلف مقامات پہ طلبہ استاذ سے سبق کی بابت بہت سے سوالات کرتے ہیں اور استاذ کی طرف سے علمی جوابات سے علم میں بہت اضافہ ہوتا ہے اور بہت سی نئی علمی باتیں احاطۂ علم میں آتی ہیں مگر ان فوائد سے طالب علم صرف ایک پیریڈ کی غیر حاضری کی وجہ سے محروم ہوجاتا ہے اور اگر مکمل دن ہی غیر حاضر رہا جائے تو پھر تو بے حساب نقصان مول لینے کے مترادف ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جس شخص کے دل کو اللہ تعالیٰ نورِ ہدایت سے منور کرنا چاہیں تو علم کی طرف اس کی راہنمائی فرما دیتے ہیں اور جس کو اس سے بے بہرہ رکھنا چاہیں تو اس سے علم وکتب سے تعلق کا شوق چھین لیتے ہیں۔" [1]

امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"علم اللہ تعالیٰ کا نور ہے جسے وہ اپنے بندے کے دل میں ڈالتا ہے لیکن اس نور سے منور ہونے کی بنیادی شرائط میں سے ایک شرط خواہشات و لغویات کو ترک کرنا ہے۔" [2]

امام مزنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ آپ کو حصولِ علم کا کس قدر شوق ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ جب میں ایک حرف سنتا ہوں یا پڑھتا ہوں تو میرے کان دوسرا حرف سننے کے لیے اور میری زبان

---

[1] مجموعة الرسائل الكبرى: 1/239. [2] السير: 13/323.

پڑھنے کے لیے بے چین ہوجاتی ہے، پھر پوچھا گیا کہ آپ علم کے کتنے حریص ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا کہ جتنا ایک دنیا دار شخص کو زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کا لالچ ہوتا ہے، پھر سوال ہوا کہ آپ علم کو کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ فرمایا کہ جس طرح ایک عورت اپنے گمشدہ بچے کو ڈھونڈ لیتی ہے اسی طرح میں بھی اسے جہاں یہ ہوتا ہے وہاں سے حاصل کر لیتا ہوں۔ [1]

عمومی مصروفیت کے اوقات سے عدمِ استفادہ

روز مرہ کی عمومی مصروفیت کے اوقات سے استفادہ نہ کرسکنا بھی ضیاعِ وقت کا بہت بڑا سبب ہے۔ عمومی مصروفیات، مثلاً: کھانے کے اوقات، دورانِ سفر، دفتر یا گھریلو کاموں میں مشغولیت یا دیگر مشاغل کو ہم باقاعدہ الگ سے وقت دیتے ہیں اور اس دوران کوئی دوسرا کام نہیں کرتے۔ حالانکہ اگر تھوڑا سا بھی اہتمام کیا جائے تو ایک ہی وقت میں کئی کام کیے جاسکتے ہیں۔ اس کی بہترین صورت یہ ہوسکتی ہے کہ آپ علمی موضوعات پر مشتمل تقاریر و مقالات یا مباحث و دروس کی آڈیو کیسٹس حاصل کریں اور جب کھانا کھانے لگیں یا گھر اور دفتر کے کسی کام کے دوران میں انھیں ٹیپ ریکارڈر میں چلا دیں اور ان سے علمی استفادہ کریں۔ اسی طرح سفر کے دوران بھی چھوٹی ٹیپ ریکارڈر یا کتاب پاس ہو تو اس دورانیے کو خاموشی، نیند یا گپ شپ میں ضائع کرنے کے بجائے اس سے بھرپور استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح آپ کے روز مرہ کے عمومی مشاغل و مصروفیات بھی متاثر نہیں ہوں گی اور انھی کے دوران ہی بہت سا علمی فائدہ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

[1] آداب الشافعي و مناقبه للرازي: 22.

اسلاف ﷭ ایسا ہی کیا کرتے تھے اور کسی بھی ایسے وقت کو جس سے کچھ بھی علمی فائدہ میسر آ سکتا ہو، ہرگز ضائع نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ﷫ کے متعلق ابن رجب ﷫ ذکر کرتے ہیں:

''آپ اپنی زندگی کا کوئی بھی وقت ضائع نہ ہونے دیتے اور وقت کی اہمیت کے پیش نظر جب کسی کام میں مشغول بھی ہوتے تو اپنے شاگردوں میں سے کسی کو فرماتے کہ اس دوران تم اونچی آواز سے کتاب پڑھتے رہنا تاکہ میں سنتا رہوں اور یہ وقت ضائع نہ ہو پائے۔''[1]

5 آلاتِ جدیدہ کا غیر ضروری استعمال

آلاتِ جدیدہ میں سے کمپیوٹر، انٹرنیٹ، موبائل فون اور ٹیلی وژن اہم ہیں اور یہ انتہائی مفید چیزیں ہیں۔ جہاں ان کے صحیح استعمال سے بہت سے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہاں ان کا غیر ضروری استعمال بہت سا قیمتی وقت ضائع کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح اگر انھیں ناجائز استعمال کیا جائے تو معاشرتی تباہی کے ساتھ ساتھ گناہوں کا باعث بھی ہے۔

عام لوگوں کے لیے بالعموم اور طلبہ کے لیے بالخصوص کمپیوٹر، موبائل اور ٹیلی وژن کا غیر ضروری اور فضول استعمال بہت سے نقصانات کا باعث ہے جن میں سب سے بڑا نقصان وقت کا ضیاع ہے، اس لیے ان آلات کو ضرورت کی حد تک ہی استعمال کرنا چاہیے اور ہر وقت انھی میں مگن رہ کر اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جو وقت آپ ان میں صَرف کرتے ہیں وہی وقت حصولِ علم کے لیے

---

[1] ذیل طبقات الحنابلہ: 249/2.

لگایا جاسکتا ہے۔

اذان و اقامت کے درمیانی وقت کا ضیاع

جہاں ہم دیگر بہت سے اوقات شعوری و لاشعوری طور پر ضائع کرتے ہیں وہاں اذان و اقامت کا درمیانی وقت بھی ایک ایسا وقت ہے جسے ہم گپ شپ، وضو، قضائے حاجت میں سستی یا ادھر اُدھر چلنے پھرنے میں ضائع کردیتے ہیں۔ حالانکہ یہ وقت بھی بہت قیمتی اور اہم ہوتا ہے۔

ہر نماز میں اذان اور اقامت کا درمیانی وقت کم از کم پندرہ بیس منٹ لازماً ہوتا ہے۔ یہ پانچ نمازوں میں گھنٹہ یا سوا گھنٹہ بن جاتا ہے۔ یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔ جیسا کہ نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«لَا يُرَدُّ الدُّعَاءُ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ»

''اذان اور اقامت کے دوران کی جانے والی دعا رد نہیں کی جاتی۔''[1]

لہٰذا اس قیمتی وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے، اپنے جمیع مسائل اس کے سامنے پیش کرنے چاہئیں اور حصولِ علم میں کامیابی کی دعا کرنی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اذان سے قبل ہی قضائے حاجت اور وضو وغیرہ سے فراغت حاصل کی جائے تاکہ جماعت سے پہلے نوافل ادا کرکے ربِّ غفور سے اپنی حاجات کے لیے رابطہ و تعلق قائم کیا جائے۔

اذان کے فوراً بعد مسجد میں پہنچ کر اس لمحے سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اذان

[1] سنن أبي داؤد، كتاب الصلاة، باب ما جاء في الدعاء بين الأذان والاقامة، حديث: 521.

سننے کے بعد جو شخص مسجد میں نہ پہنچے اور ادھر ادھر کے کاموں میں مصروف رہے تو وہ اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، پھر مسجد میں تاخیر سے پہنچنا جہاں ضیاعِ وقت کا سبب ہے وہاں تاخیر سے یا عین اقامت کے وقت پہنچنے پر فرشتوں کی دعاؤں اور صفِ اوّل اور تکبیرِ اولیٰ کے اجر سے محرومی کا بھی باعث ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں کہ ابراہیم بن میمون بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ کام کے دوران میں اذان کی آواز ان کے کانوں میں پڑتی تو وہ ہتھوڑے کی ضرب بھی نہیں لگاتے تھے بلکہ اسے وہیں رکھ دیتے اور جلدی سے مسجد کی طرف چل پڑتے۔" [1]

⑦ عوامی و سیاسی جلسوں میں شرکت

سیاسی اور عوامی جلسوں میں شرکت سے وقت کا ضیاع ہی ہوتا ہے۔ البتہ کچھ پروگرام ملکی و ملی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں، ان میں شرکت دینی و ملی تقاضا ہوسکتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں بھی اپنے حالات کو مدنظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ گھر میں بوڑھے والدین یا کوئی فرد، بیماری وغیرہ کی صورت میں خدمت اور تیمارداری کا محتاج ہوسکتا ہے۔ امتحانات کے دوران بھی ایسے پروگراموں میں شرکت سے احتراز کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ نفل پڑھتے رہیں اور فرض چھوٹ جائے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ.

[1] التهذيب: 173/1.

اچھا عالم

بننے کے لیے...!



ایک طالب علم حصولِ علم کی سیڑھی پر چڑھنے لگتا ہے تو خواہشات اسے چڑھنے نہیں دیتیں، معاشرہ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے، جوں جوں وہ اوپر چڑھتا ہے اسے اسی قدر تیز آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کہیں مشکلات کے پہاڑ نظر آتے ہیں اور کہیں مشقتوں کے ٹیلے، اس لحاظ سے بہت کم طالب علم ہی اپنی منزل پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس حوالے سے ان کے لئے کوئی راہ نما کتاب نہیں ہوتی جسے پڑھ کر وہ حصولِ علم کی منزل کو آسان بنا لیں اور راستے کی مشکلات کا عمدہ طریقے سے سامنا کر پائیں۔ اسی اہم ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز سدحان حفظہ اللہ نے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ اس کتاب کو عمدہ اسلوبِ اُردو میں ڈھال کر ذخیرۂ کتب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ ہر طالب علم اور طالبہ کی ایک اہم ضرورت ہے اور ان کے لیے مشعلِ راہ ہے، لہٰذا یہ کتاب ان تک ضرور پہنچایئے!



مسلم پبلیکیشنز

12 عثمان غنی روڈ، سنت نگر، لاہور 042-37249678

2 فلور، الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور 042-37247266

0322-4044013 | 0322-4259678